تنقیحات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تنقیحات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۷۳۱
© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : تنقیحات
مصنف : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
صفحات : ۲۲۸
اشاعت :
ساتواں ایڈیشن : مارچ ۲۰۱۷ء
تعداد : ۱۱۰۰
قیمت : -/۱۲۰ روپے
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵
فون: ۲۶۹۸۱۶۵۲، ۲۶۹۸۳۳۴۷ فیکس: ۲۶۹۸۷۸۵۸
E-mail: mmipublishers@gmail.com
Website: www.mmipublishers.net
مطبوعہ : اچ۔ایس۔آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

ISBN 81-8088-224-1

TANQEEHAT (Urdu)
By: Maulana Sayyid Abul A'la Maudoodi
Pages: 228
Price: ₹ 120.00

ترتیب

دیباچہ ۵
ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب ۷
ہندستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط ۱۸
دورِ جدید کی بیمار قومیں ۲۵
انسانی قانون اور الٰہی قانون ۳۴
مغربی تہذیب کی خودکشی ۴۶
لارڈ لوتھین کا خطبہ ۵۷
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ۷۱
عقلیت کا فریب (۱) ۸۲
عقلیت کا فریب (۲) ۹۵
تجدد کا پائے چوبیں ۱۰۵
ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص ۱۱۹
ملت کی تعمیرِ نو کا صحیح طریقہ ۱۲۹
بغاوت کا ظہور ۱۳۷

اجتماعی فساد	۱۴۷
ایمان اور اطاعت	۱۵۸
مسلمان کا حقیقی مفہوم	۱۶۴
مسلمان کی طاقت کا اصل منبع	۱۷۶
کیش مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں	۱۸۷
مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل	۱۹۷
مرض اور اس کا علاج	۲۱۴

دیباچہ

اس مجموعہ میں وہ چھوٹے چھوٹے مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں جو میں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر مختلف اوقات میں لکھے ہیں۔ اُن میں غیر اسلامی اثرات اور مسلمانوں کی کوتاہیوں پر تنقید بھی ہے، اور غلط فہمیوں میں اُلجھے ہوئے حقائق کی تنقیح بھی۔ جو علمی اور عملی مسائل آج کل شب و روز پیدا ہو رہے ہیں، اُن کو حل کرنے کے لیے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ لوگ ان کو صحیح روشنی میں دیکھیں، اور خود اُن کی اپنی بصیرت رنگین نہ رہے۔ اسی لیے ادارہ دارالاسلام کے علمی شعبہ کی جانب سے یہ مجموعہ ابتدا ہی میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ خیالات کے صاف کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔

اس مجموعہ کو ایک مسلسل اور مربوط کتاب کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس کا ہر مضمون بجائے خود مستقل ہے۔ البتہ ان مختلف مضامین میں ایک مقصدی ربط ضرور پایا جاتا ہے اور اسی ربط کے لحاظ سے انھیں ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔

ابوالاعلیٰ

۸ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ (۷ رجون ۱۹۳۹)

ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب

حکومت و فرماں روائی اور غلبہ و استیلا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ، دوسرا سیاسی اور مادّی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اس کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تخیلات، اسی کے معتقدات، اُسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں۔ ذہنیتیں اسی کے سانچے میں ڈھلیں، تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو، اسی کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھہرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ اگر ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائلِ ثروت پر قابض اور اُن کے نظمِ مملکت پر حاوی ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجیے جو اوپر غلبہ کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو، لیکن فطری قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی اور تحقیق و اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادّی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لیے ذہنی و مادّی حیثیت سے درماندہ

اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کر جاتی ہیں، اُسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لیے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں، اور طاقت ور۔۔۔ ذہنی اور مادّی دونوں حیثیتوں سے طاقت ور۔۔۔ قومیں ان کے دماغ اور اُن کے جسم دونوں پر حکمراں ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آج کل اسی دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسم کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، اُن کے دفتر، اُن کے بازار، اُن کی سوسائٹی، اُن کے گھر، حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ اُن پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمراں ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں، مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مغرب کی بتائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہرصورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار اُن کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے، اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر اُتر آئی۔ اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی اعلانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے، کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

جب ہماری آزاد قوموں کا حال یہ ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا حال کیا پوچھنا۔ اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لیے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے مگر مختصراً اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ذہنی غلبہ و استیلا کی بنا دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے۔ جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے اور اسی کے افکار دنیا پر

چھا جاتے ہیں۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اسے مقلد و متبع بننا پڑتا ہے، اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں۔ مجتہد و محقق قوم کے طاقت ور افکار و معتقدات کا سیلاب اُن کو بہا لے جاتا ہے، اور ان میں اتنا بل بوتا نہیں رہتا کہ اپنی جگہ پر رہ جائیں۔ مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے تمام دنیا کی قومیں اُن کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوعِ انسانی کے افکار پر غالب رہی۔ حسن و قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا، اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں اربابِ فکر اور اصحابِ تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے۔ جب انھوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، جب وہ اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انھوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفا دے دیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں۔ انھوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا۔ کائنات کے راز ٹٹولے اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے، اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ نیند کے مارے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے تو دیکھا کہ مسیحی یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی مگر نہ قلم کا زور تھا نہ تلوار کا۔ شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سوادِ اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آئے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں نے ان کو ایمان کا درجہ دے دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول اور تمدنی آئین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے، اس نئے اور طاقت ور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے اور ایک

غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہوگیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے اور وہی صحت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا اُن میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلے میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ مغربی تہذیب کے اساسی اُصول کلیتًا اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ اور جس تاریخ سے پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہوگئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت ہی کی لڑائی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا مشاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت، ان کے مظاہر پر غور و فکر اور اُن کو ترتیب دے کر قیاس و برہان کے ذریعہ سے نتائج کا استنباط کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے، مگر سوءِ اتفاق سے نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی علمی تحریک رونما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنھوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا اور یہ جو سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پیوندِ خاک ہو جائے گی۔ اس غلط تخیل کے زیر اثر انھوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اُس کو روکنے کے لیے قوت سے

کام لیا۔ مذہبی عدالتیں (Inquisition) قائم کی گئیں جن میں اس تحریک کے علم برداروں کو سخت وحشیانہ اور ہولناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی اس لیے تشدد سے دبنے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حریتِ فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابتدا میں لڑائی حریتِ فکر کے علم برداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تھی مگر چوں کہ مذہبی پیشوا مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لیے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحیت اور آزاد خیالی کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد نفسِ مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مدِّ مقابل قرار دیا گیا۔ سائنٹفک طریقہ پر سوچنے کے یہ معنی قرار پائے کہ یہ طریقِ فکر مذہبی طریقِ فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص سائنٹفک طریقہ سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہے کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالمِ طبیعیت (Physical World) کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا اس لیے جدید تحریک کے علم برداروں نے لازم سمجھا کہ خدا یا کسی فوق الطبیعیت (Supernatural) ہستی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہر اس طریقہ کو خلافِ حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہلِ حکمت و فلسفہ میں خدا اور روح یا روحانیت اور فوق الطبیعیت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہوگیا جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لیے تبری نہ کرتے تھے کہ دلائل اور براہین سے اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہوگیا تھا۔ بلکہ اس سے اس لیے بیزار تھے کہ وہ اُن کے اور اُن کی آزادیِ خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں اُن کی عقل و فکر اور اُن کی علمی جدوجہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ اُن کا رُخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چونکہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے ہوئے تھے اس لیے وہ ابتداءً نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہتے رہے۔ مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا

کے ساتھ ہر اُس چیز کا تخیل جو عالمِ طبیعیت سے بالاتر ہو، اُن سے بالکل غائب ہوگیا اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادّہ حرکت کے سوا کوئی شے اُن کے نزدیک حقیقی نہ رہی، سائنس، نیچریت کا ہم معنی قرار پا گیا اور اہلِ حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہوگیا کہ ہر چیز جو ناپی اور تولی نہیں جاسکتی اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ وسائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes) متوفی ۱۶۵۰ء جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے۔ اور مادّہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالمِ طبیعیت کے آثار کی توجیہ میکانکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریقِ فکر کی بنیاد رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (Hobbes) ۱۶۷۹ء اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فوق الطبیعت (Supernatural) کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظامِ عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہہ کے قابل قرار دیتا ہے۔ اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کا قائل نہیں ہے جو مادّی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانہ میں اسپائنوزا (Spinoza) م ۱۶۷۷ء اٹھا جو سترھویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اس نے مادّہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنا دیا اور اُس کل میں خدا کے اختیارِ مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنیز (Liabeniz) م ۱۷۱۶ء اور لاک (Locke) م ۱۷۰۴ء خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔

یہ سترھویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، اسی طرح سائنس نے بھی سترھویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپرنیکس (Copernicus)، کیپلر (Kepler)، گیلیلیو (Galileo)، نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علم برداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الوہی نظریہ سے قطع نظر کر کے اُن قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے جو اس نظام کو چلا رہی ہیں اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہش مند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الٰہی نقطۂ نظر سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس دہریت اور نیچریت کا تخم تھا جو بعد میں حریتِ فکر کے درخت سے پیدا ہوئی، لیکن

سترھویں صدی کے حکما کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچ سکے اور یہی سمجھتے رہے کہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ جو طریقِ فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظامِ کائنات کی جستجو کرے گا وہ مادّیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (John Toland)، ڈیوڈ ہارٹلے (David Hartlay)، جوزف پریسٹلے (Joseph Priestley)، والٹیر (Voltaire)، لامیٹری (La Matrie)، ہولباخ (Holback)، کیبانیس (Cabanis)، ڈینس ڈائیڈیرو (Denis Diderot)، مانٹسکیو (Montesquieu)، روسو (Rousseau) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ و حکما پیدا ہوئے جنھوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرماں روا (Constitutional Monarch) سے زیادہ نہ سمجھی جو نظامِ کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہوگیا اور اب اس نظام کے چلانے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ عالمِ طبیعیت اور دنیائے مادّہ و حرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہیں۔ ہیوم (Hume) نے اپنی تجربیت (Empiricism) اور فلسفۂ تشکیک (Scepticism) سے اس طریقِ فکر کی زبردست تائید کی اور معقولات کی صحت کے لیے بھی تجربہ ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلے (Burkeley) نے مادّیت کی اس بڑھتی ہوئی رَو کا جان توڑ مقابلہ کیا، مگر وہ اس کو نہ روک سکا۔ ہیگل (Hegel) نے مادّیت کے مقابلہ میں تصوریت (Idealism) کو فروغ دینا چاہا مگر ٹھوس مادّے کے مقابلہ میں لطیف تصور کی پرستش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے بیچ کی راہ نکالی کہ خدا کی ہستی، روح کا بقا اور ارادے کی آزادی اُن چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں مانی نہیں جاسکتیں، تاہم اُن پر ایمان لایا جاسکتا ہے، اور حکمتِ عملی (Practical Wisdom) اس کی مقتضی ہے کہ اُن پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی، لیکن ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب عقل و فکر کی گمراہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل اور بے اختیار ہستی قرار دے لیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لیے اس کو ماننا، اس سے ڈرنا اور اس کی خوشنودی چاہنا، سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادّیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوکت (Vegt)، بوخنر (Buchner)، سولیے (Czelle)، کومت (Comte)، موبشات (Mobechoute) اور دوسرے حکما وفلاسفہ نے مادّہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ میں تجربیت اور اخلاق میں افادیت (Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقائیت اور نظامِ کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہوجانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology)، عضویات (Physiology)، ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے اکتشافات، عملی سائنس کی ترقی اور مادّی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے۔ کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ کوئی اس کو چلانے والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے، کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادّے میں جان کسی کے امر سے نہیں پڑتی، بلکہ خود مادّہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اُس میں جان پڑ جاتی ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور، فکر سب اسی ترقی یافتہ مادّہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پُرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اُسی طور کے افعال اُن سے صادر ہوتے ہیں۔ اُن میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ (Free Will) نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہوجانا، اُن کی انرجی کا خرچ ہوجانا ہی اُن کی موت ہے جو فنائے محض کی ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہوگئے۔ اب اُن کے لیے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے اس نیچریت اور مادیت کو استحکام بخشنے اور مدلل و منظم علمی نظریہ کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) جو ۱۸۸۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریق استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا اکمل ترین طریقہ تھا، اس نظریہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی

کہ کائنات کا کاروبار خدا کے پیغمبر بغیر چل سکتا ہے۔ آثار ومظاہرِ فطرت کے لیے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علّت کی حاجت نہیں، زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لے کر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقا ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل وحکمت کے جوہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواعِ حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جان دار مشین جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی، تنازع للبقاء بقاءِ اصلح، اور انتخابِ طبعی کے نتیجہ کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہوگئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیاتِ دنیا کے حساب وکتاب کا کوئی کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادّی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے، ان پر اسلام کی عمارت ایک لحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی، گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اُسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہوجائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادّہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلا سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا، جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے ان کے لیے مشکل ہوگیا کہ مغرب کے فلسفہ وسائنس اور ان کی پردردہ

تہذیب کے رعب وداب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ اُن مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہِ راست کسی مغربی سلطنت کے زیرِ حکم آ گئی تھیں۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چوں کہ یہ تحصیل علم خالص تحصیلِ علم کی خاطر نہ تھی اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدّت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے، جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروع میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابلِ تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلا سے قطع نظر، مغرب کا علمی اور فکری داب و تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہلِ فکر پیدا نہ ہوں گے۔ اسلام میں ایک نشاۃِ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب آگے بڑھ چکی ہے۔ اُس کو اب اُلٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے، جن سے وہ چھ سو برس پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب

چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریقِ فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظامِ فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اُٹھے، ملحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادّی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مقصد و مدعا کی تمثیل کے پیرایہ میں یوں سمجھئے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اُسی رُخ پر سفر کرتی ہے جس رُخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں۔ جو لوگ اس میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ جانا چاہیں۔ اگر گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رُخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں یا بائیں پھیر دے۔ مگر نشست کا رُخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رُخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رُخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکرِ اسلامی سے بے بہرہ ہیں اس لیے گاڑی اپنے مسافروں کو لیے ہوئے الحاد اور مادّہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزلِ مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلنے کے لیے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اُٹھیں اور جدوجہد کر کے انجن کو اُن ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا، گاڑی کا رُخ نہ بدلے گا اور ہمارے جھنجھلانے، بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ۔ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ہندستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ اُن ممالک پر مشتمل ہے جو صدرِ اوّل کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں۔ اُن کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری، اور حصولِ غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ وہ طلب دنیا کے بجائے طلبِ آخرت کے نشے میں سرشار تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باج گزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انھیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی پوری آبادی یا اُس کے سوادِ اعظم کو ملّت حنفی میں جذب کر لیا۔ علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیب اسلامی کے علم بردار اور علوم اسلامی کے معلم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدر اوّل کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جب کہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی روح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ پکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے ان ممالک میں کلیتًا ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کر لی۔

بدقسمتی سے ہندستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدرِ اوّل میں اس ملک کا بہت تھوڑا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے حصہ پر بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیامیٹ کر دیا۔ اس کے بعد جب ہندستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا تو فاتحوں میں صدرِ اول کے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے یہاں اشاعتِ اسلام کے بجائے توسیعِ مملکت میں

اپنی قوتیں صرف کیں اور لوگوں سے اطاعتِ خدا و رسول کے بجائے اپنی اطاعت اور باج گزاری کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرماں روائی کے بعد بھی ہندستان کا سوادِ اعظم غیر مسلم رہا۔ یہاں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی۔ یہاں کے باشندوں میں سے جنھوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا۔ نومسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے۔ اور خود باہر کے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہل ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس زمانہ میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا اس زمانہ میں بھی یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے، اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدن بالذات ضعیف تھا اور محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہو گیا تھا لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سوادِ اعظم پر چھایا رہا اور ہندستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے کا اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اتنا صحیح اور پختہ اور کامل مسلمان نہ ہو سکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہو سکتا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد قضائے الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا اور ایک صدی کا زمانہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان اُس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے، جس پر انھوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی۔ اس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔ اسلامی

قوانین کو منسوخ کیا۔ شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کیے۔ اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں نکاح وطلاق وغیرہ تک محدود کر دیا اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں، محمڈن لا، روز بروز مسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ابتدا سے انگریزی حکومت کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت اس قوم کو مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق اور ذلیل وخوار کر کے چھوڑ اگیا۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لگی۔ اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا، ان کے دلوں پر مایوسی اور احساسِ ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلط کر دیں، ان کو انگریزی اقتدار نے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ اور ذلت وخواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت، اور ترقی کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا کوئی اور نہیں ہے، اور ان کا اپنا سرمایہ علم وتہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل، سببِ ذلّت اور موجب نکبت ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھا۔

ایک یہ کہ وہ فکر وعمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ اُن کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام معائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ اُن کے قلب وروح پر بھی مسلط ہو چکی تھی اور وہ تمام قوتوں سے محروم کر دیے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تمدن وتہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اس دوہری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انھیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں اور اُن

کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ مرحوم سید احمد خاں کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس کے اثر سے تمام مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ دولت وعزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا۔ ہندستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے۔ قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلّمی کے کام آئے، اور خوش حال طبقے کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیے گئے تاکہ اُن کے دل ودماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم وفنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادّیت انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارھویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا۔ جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی رہنمائی میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے پرانے نظریے باطل ہو کر نئے نظریے قائم ہو چکے تھے۔ یورپ میں ایک خاص تہذیب پیدا ہو چکی تھی جس کی بنیاد کلیتاً انھی جدید نظریوں پر قائم تھی۔ اس انقلاب عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہنمائی پر مبنی تھے کلی طور پر خارج کر ہی دیا تھا، البتہ تخیل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی، سو اَب اس کے خلاف زبردست جنگ جاری تھی۔ اگرچہ علوم حکمت میں سے کسی علم نے بھی کائنات کے الٰہی نظریہ کے خلاف کوئی ثبوت (جس کو ثبوت کہا جا سکتا ہو) بہم نہیں پہنچایا تھا مگر اہلِ حکمت بغیر کسی دلیل کے محض اپنے رجحانِ طبیعت کی بنا پر خدا سے بیزار اور الٰہی نظریہ کے دشمن تھے اور چونکہ انھی کو اس وقت دنیا کی عقلی وعملی امامت کا منصب حاصل تھا اس لیے ان کے اثرات سے خدا سے بیزاری (Theophobia) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا۔ وجود باری کا انکار، کائنات کو آپ سے آپ ہونے والی اور آپ سے آپ قوانینِ طبعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا، خدا پرستی کو توہم (Superstition) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری وتاریک خیالی کہنا اور نیچریت (Naturalism) کو روشن خیالی کا ہم معنی سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ فلسفہ وسائنس میں

کچھ بھی دست گاہ نہ رکھتا ہو اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذرہ برابر بھی کوشش نہ کی ہو، صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جائے۔ روحانیت (Spiritualism) یا فوق الطبیعت (Supernaturalism) کی تائید میں کچھ کہنا اس وقت کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا تو سائنٹفک حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of Species) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریۂ ارتقا کی تائید میں پیش کیے تھے، کمزور اور محتاجِ ثبوت تھے۔ اس سلسلۂ ارتقا میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں۔ اہلِ حکمت اس وقت بھی اس نظریے سے مطمئن نہ تھے حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے (Huxley) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا۔ مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کر لیا گیا۔ اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلہ کے طور پر اسے استعمال کیا گیا۔ کیونکہ اس نظریہ نے اہلِ حکمت کے زعمِ باطل میں اس دعویٰ کا ثبوت فراہم کیا تھا (حالانکہ دراصل ایک دعویٰ کیا تھا جو محتاجِ ثبوت تھا) کہ کائنات کا نظام کسی قوت کے بغیر خود بخود طبیعی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اہلِ مذہب نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا۔ مگر شکست کھائی اور آخر کار اہلِ مذہب سائنٹفک دہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ء میں جب ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی۔ حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے اذہان کو الحاد و زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور لادینیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا، جس نے آخر کار بالشوزم اور فاشزم کو پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ

کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رُخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب و ہوا کی اوّلین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمۂ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی، ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیاتِ احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ اسلام کا پورا نظامِ تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے من جانب اللہ ہونے میں شبہہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظامِ اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں وہاں وہ محض عہدِ جاہلیت کے رسوم ہیں، جن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصولِ تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خود خدا واضع قانون ہے۔ رسولِ خدا شارحِ قانون اور انسان صرف متبعِ قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضعِ قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ لیجسلیچر واضعِ قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمحِ نظر حکومتِ الٰہی ہے اور مغرب کا مطمحِ نظر حکومتِ قومی۔ اسلام کا رُخ بین الاقوامیت (Internationalism) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت (Nationalism)۔ معاشیات میں اسلام اکلِ حلال اور زکوٰۃ و صدقہ اور تحریم سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظامِ معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیشِ نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیشِ نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدودِ زن و مرد، تعددِ ازدواج،

قوانینِ نکاح وطلاق، ضبطِ ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوقِ زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں اُن دونوں کا اختلاف نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت کے اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم وتربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہوسکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول وقوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو بر سرِ غلط سمجھا اور اس کے اصول وقوانین میں ترمیم وتنسیخ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر اُن کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہوسکتی۔

(ترجمان القرآن، رجب ۱۳۵۳ھ اکتوبر ۱۹۳۴ء)

دورِ جدید کی بیمار قومیں

مشرق ہو یا مغرب، مسلمان ہو یا غیر مسلم، بلا استثنا سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلط ہوگئی ہے جس نے سراسر مادیت کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اس کی حکمتِ نظری وحکمتِ عملی، دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا سائنس، اس کا اخلاق، اس کی معیشت، اس کی معاشرت، اس کی سیاست، اس کا قانون، غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطۂ آغاز سے چل کر ایک غلط رُخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے، اور اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آرہی ہے۔

اس تہذیب کا آغاز ایک ایسی قوم میں ہوا جس کے پاس درحقیقت حکمتِ الٰہی کا کوئی صاف اور پاکیزہ سرچشمہ نہ تھا۔ مذہب کے پیشوا وہاں ضرور موجود تھے مگر ان کے پاس حکمت نہ تھی، ان کے پاس علم نہ تھا، ان کے پاس خدا کا قانون نہ تھا۔ محض ایک غلط مذہبی تخیل تھا جو فکر وعمل کی راہوں میں نوعِ انسانی کو سیدھے راستے پر اگر چلانا چاہتا بھی تو نہ چلاسکتا تھا۔ وہ بس اتنا ہی کرسکتا تھا کہ علم وحکمت کی ترقی میں سدِ راہ بن جاتا چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اس مزاحمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ترقی کرنا چاہتے تھے وہ مذہب اور مذہبیت کو ٹھوکر مار کر ایک دوسرے راستے پر چل پڑے، جس میں مشاہدہ، تجربہ اور قیاس واستقرا کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما نہ تھی۔ یہی ناقابلِ اعتماد رہنما، جو خود ہدایت اور نور کے محتاج ہیں ان کے معتمد علیہ بن گئے۔ ان کی مدد سے انھوں نے فکر ونظر، تحقیق واکتشاف، اور تعمیر وتنظیم کی راہ میں بہت کچھ جدوجہد کی، مگر اُن کو ہر میدان میں ایک غلط نقطۂ آغاز نصیب ہوا اور ان کی تمام ترقیات کا رُخ ایک غلط منزلِ مقصود کی

طرف پھر گیا۔ وہ الحاد اور مادّیت کے نقطہ سے چلے۔ انھوں نے کائنات کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ آفاق اور انفس میں یہ سمجھ کر نظر کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے مشاہدات اور محسوسات کی ہے۔ اور اس ظاہری پردے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ تجربہ اور قیاس سے انھوں نے قانونِ فطرت کو جانا اور سمجھا مگر اس کے فاطر تک نہ پہنچ سکے۔ انھوں نے موجودات کو مسخر پایا اور ان سے کام لینا شروع کیا۔ لیکن اس تخیل سے ان کے ذہن خالی تھے کہ وہ بالاصل ان اشیاء کے مالک اور حاکم نہیں ہیں، بلکہ اصلی مالک کے خلیفہ ہیں۔ اس جہالت وغفلت نے انھیں ذمہ داری اور جواب دہی کے بنیادی تصور سے بیگانہ کر دیا اور اس کی وجہ سے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اساس ہی غلط ہوگئی۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کے پرستار بن گئے، اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے جو فکر و عمل کے میدان میں ان کو ایسے راستوں پر لیے جارہی ہے جن کی درمیانی منزلیں تو نہایت خوش آئند اور نظر فریب ہیں۔ مگر آخری منزل بجز ہلاکت کے اور کوئی نہیں، وہی ہے جس نے سائنس کو انسان کی تباہی کا آلہ بنایا۔ اخلاق کو نفسانیت، ریا، خلاعت اور بے قیدی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ معیشت پر خود غرضی اور برادر کشی کا شیطان مسلط کر دیا۔ معاشرت کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں نفس پرستی، تن آسانی اور خود کامی کا دہرامار دیا، سیاست کو قوم پرستی و وطنیت، رنگ و نسل کے امتیازات اور خداوندِ طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت بنا دیا۔ غرض یہ کہ وہ تخمِ خبیث جو مغرب کی نشأۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجرِ خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں۔ جس کے پھول خوشنما مگر خاردار ہیں، جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی۔ اور اندر ہی اندر نوعِ بشری کے خون کو مسموم کیے جارہی ہے۔

اہلِ مغرب جنھوں نے اس شجرِ خبیث کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ اب خود اس سے بیزار ہیں۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش بہت سی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔ جس شاخ کو کاٹتے ہیں اس کی جگہ بہت سی خاردار شاخیں نکل آتی ہیں۔ سرمایہ داری پر تیشہ چلایا تو اشتراکیت نمودار ہوگئی۔ جمہوریت پر ضرب لگائی تو ڈکٹیٹرشپ پھوٹ نکلی۔ اجتماعی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو نسوانیت (Feminism)

اور برتھ کنٹرول کا ظہور ہوا۔ اخلاقی مفاسد کا علاج کرنے کے لیے قوانین سے کام لینے کی کوشش کی تو قانون شکنی اور جرائم پیشگی نے سر اٹھایا، غرض فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو تہذیب و تمدن کے اس درخت سے نکل رہا ہے، اور اس نے مغربی زندگی کو از سرتا پا مصائب و آلام کا ایک پھوڑا بنا دیا ہے جس کی ہر رگ میں ٹیس اور ہر ریشے میں دکھن ہے۔ مغربی قومیں درد سے بےتاب ہو رہی ہیں۔ ان کے دل بےقرار ہیں۔ ان کی روحیں کسی امرت رس کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ مگر انھیں خبر نہیں کہ امرت رس کہاں ہے۔ ان کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجرِ خبیث کی محض شاخوں میں ہے اس لیے وہ شاخیں کاٹنے میں اپنا وقت اور اپنی محنتیں ضائع کر رہی ہیں۔ مگر نہیں سمجھتی کہ خرابی جو کچھ بھی ہے اس درخت کی جڑ میں ہے۔ اور اصلِ فاسد سے فرعِ صالح نکلنے کی امید رکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف ایک قلیل جماعت ایسے صحیح العقل لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ ان کے شجرِ تہذیب کی جڑ خراب ہے مگر چونکہ وہ صدیوں تک اسی درخت کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ہیں اور اسی کے ثمرات سے ان کی ہڈی بوٹی بنی ہے، اس لیے اُن کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس اصل کے بجائے کون سی دوسری اصل ایسی ہوسکتی ہے جو صالح برگ و بار لانے کی قوت رکھتی ہو۔ نتیجہ میں دونوں جماعتوں کا حال ایک ہی ہے۔ وہ سب کے سب بیتابی کے ساتھ کسی چیز کے طالب ہیں جو اُن کے درد کا درماں کرے، مگر انھیں خبر نہیں کہ ان کا مطلوب کیا ہے اور کہاں ہے۔

یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمہاری روحیں بےقرار ہیں، یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے ہو۔ یہ ہے وہ شجرِ طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح، جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بےخار بھی، جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جاں بخش بھی، جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور روح پرور بھی۔ یہاں تم کو حکمتِ عملی ملے گی۔ یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ملے گا۔ یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں بلکہ کارزارِ دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے سکونِ قلب اور جمعیتِ خاطر کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے وہ بلند اور پائیدار قواعد ملیں گے جو انسانی فطرت کے علم پر مبنی ہیں اور خواہشاتِ

نفس کے اتباع میں بدل نہیں سکتے۔ یہاں تم کو تہذیب و تمدن کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات اور اقوام کی مصنوعی تفریقوں کو مٹا کر خالص عقلی بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں، اور عدل، مساوات، فیاضی اور حسنِ معاملات کی ایسی پُر امن اور مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں، جس میں افراد اور طبقات اور فرقوں کے درمیان حقوق کی کشمکش اور مفاد و مصالح کے تضاد اور اغراض و مقاصد کے جنگ کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہتا بلکہ سب کے سب باہمی تعاون کے ساتھ شخصی و اجتماعی فلاح کے لیے خوش دلی اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔ اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہو تو قبل اس کے کہ تمہاری تہذیب ہولناک صدمہ سے پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ تہذیبوں میں ایک اور مٹی ہوئی تہذیب کا اضافہ کرے تم کو چاہیے کہ اسلام کے خلاف ان تمام تعصبات کو جو تمہیں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے وراثت میں ملے ہیں اور جن کو تم نے اس تاریک دور کی تمام دوسرے چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں چھوڑا ہے، اپنے دلوں سے نکال ڈالو اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو، سمجھو اور قبول کرو۔

مسلمان قوموں کا حال مغربی قوموں کے حال سے مختلف ہے۔ مرض اور ہے اسبابِ مرض بھی دوسرے ہیں، مگر علاج ان کا بھی وہی ہے جو اہلِ مغرب کا ہے۔ یعنی اس علم و ہدایت کی طرف رجوع جس کو اللہ نے اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری نبیؐ کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا ہے وہ ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوئے ہیں۔ رومی، فارسی، ہندی اور چینی تہذیبیں اس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب اسلام اپنے متبعین کی فکری و عملی قوتوں پر پورے زور کے ساتھ حکمراں تھا۔ جہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کارفرما تھی، روحانی اور مادّی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غالب قوم تھے اور تمام اقوامِ عالم کی پیشوائی کا منصب ان کو حاصل تھا۔ اس وقت کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی۔ انھوں نے جس طرف رُخ کیا، قوموں کے حالات، نظریات، علومِ اخلاق و عادات اور طرزِ تمدّن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان میں تاثر کی قابلیت کم اور تاثیر کی قوت بہت زیادہ تھی۔ بلاشبہ انھوں نے دوسروں سے بہت کچھ لیا، مگر اُن کی تہذیب کا مزاج اس قدر طاقت ور اور مضبوط

تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی وہ اس کی طبیعت کے مطابق ڈھل گئی۔ اور کسی بیرونی اثر سے اس میں سوءِ مزاج مختلف پیدا نہ ہو سکا۔ بخلاف اس کے انھوں نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے وہ انقلاب انگیز ثابت ہوئے۔ بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں اور بعض جن میں زندگی کی طاقت زیادہ تھی وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے اصولوں میں بہت کچھ تغیر واقع ہو گیا۔ مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

مسلمان صدیوں تک قلم اور تلوار کے ساتھ فرماں روائی کرتے کرتے آخر کار تھک گئے۔ ان کی روحِ جہاد سرد پڑ گئی۔ قوتِ اجتہاد شل ہو گئی، جس کتاب نے اُن کو علم کی روشنی اور عمل کی طاقت بخشی تھی اس کو انھوں نے محض ایک متبرک یادگار بنا کر غلافوں میں لپیٹ دیا۔ جس ہادیِ اعظمؐ کی سنت نے ان کی تہذیب کو ایک مکمل فکری و عملی نظام کی صورت میں متشکل کیا تھا اس کی پیروی کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ترقی کی رفتار رُک گئی۔ بہتا ہوا دریا یکایک جمود کی وادی میں ٹھہر کر تالاب بن گیا۔ امامت کے منصب سے مسلمان معزول ہوئے۔ دنیا کی قوموں پر اُن کے افکار، اُن کے علوم، اُن کے تمدن اور ان کے سیاسی اقتدار نے جو قابو پالیا تھا، اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی، پھر اسلام کے بالمقابل ایک دوسری تہذیب نے جنم لیا۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا، مغربی قوموں نے اٹھالیا۔ مسلمان سوتے رہے اور اہلِ مغرب اس جھنڈے کو لے کر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ امامت کا منصب جس سے یہ معزول ہو چکے تھے ان کو مل گیا۔ ان کی تلوار نے دنیا کے سوادِ اعظم کو فتح کیا۔ ان کے افکار و نظریات، علوم و فنون اور اصولِ تہذیب و تمدن دنیا پر چھا گئے۔ ان کی فرماں روائی نے صرف اجسام ہی کا نہیں، دلوں اور دماغوں کا بھی احاطہ کر لیا۔ آخر صدیوں کی نیند سے جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ دوسرے اُس پر قابض ہو چکے ہیں۔ اب علم ہے تو اُن کا ہے۔ تہذیب ہے تو اُن کی ہے۔ قانون ہے تو اُن کا ہے۔ حکومت ہے تو اُن کی ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔

اب اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم ایک دوسرے ڈھنگ پر ہو رہا ہے۔ یقیناً مغربی تہذیب کسی حیثیت سے بھی اسلام کے مقابلہ کی تہذیب نہیں۔ اگر تصادم اسلام سے ہو تو دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر اسلام ہے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت

ہے، نہ اسلامی اخلاق، نہ اسلامی افکار ہیں، نہ اسلامی اسپرٹ۔ حقیقی اسلامی روح نہ ان کی مسجدوں میں ہے، نہ مدرسوں میں ہے، نہ خانقاہوں میں۔ عملی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔ اسلام کا قانون نہ ان کی شخصی زندگی میں نافذ ہے نہ اجتماعی زندگی میں۔ تمدن و تہذیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا نظم صحیح اسلامی طرز پر باقی ہو۔ ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افسردہ، جامد اور پسماندہ تہذیب کا مقابلہ ایک تہذیب سے ہے جس میں زندگی ہے، حرکت ہے، روشنی علم ہے، گرمی عمل ہے۔ ایسے نامساوی مقابلہ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی ظاہر ہو رہا ہے، مسلمان پسپا ہو رہے ہیں۔ ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے، وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی فکری و نظری قوتیں مغربی اصولوں کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے تصورات، ان کے اخلاق، ان کی معیشت، ان کی معاشرت، ان کی سیاست، ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔ اور ان کی نئی نسلیں اس تخیل کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ زندگی کا حقیقی قانون وہی ہے جو مغرب سے ان کو مل رہا ہے، یہ شکست دراصل مسلمانوں کی شکست ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس کو اسلام کی شکست سمجھا جاتا ہے۔

ایک ملک نہیں جو اس مصیبت میں گرفتار ہو۔ ایک قوم نہیں جو اس خطرہ میں مبتلا ہو۔ آج تمام دنیائے اسلام اسی خوف ناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ درحقیقت یہ علما کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کی اصول و مبادی کو سمجھتے۔ مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کار آمد علمی اکتشاف اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے اور ان نئے کل پرزوں کو اصولِ اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی ہو جاتی اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علما (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی، ان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسولِ خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں اُن سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے

وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانہ کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ وہ ہر معاملہ میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے کہ اُن کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کر سکتے جب کہ زمانہ بالکل بدل چکا تھا اور علم و عمل کی دنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو چکا تھا جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی، مگر کسی غیر نبی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی کہ قرنوں اور صدیوں کے پردے اٹھا کر اُن تک پہنچ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ علماء نے نئی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کی مگر مقابلہ کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی وہ اُن کے پاس نہ تھا۔ حرکت کا مقابلہ جمود سے نہیں ہو سکتا۔ رفتارِ زمانہ کو منطق کے زور سے نہیں بدلا جا سکتا۔ نئے اسلحہ کے سامنے فرسودہ اور زنگ آلود ہتھیار کام نہیں دے سکتے۔ علما نے جن طریقوں سے اُمت کی رہنمائی کرنی چاہی اُن کا کامیاب ہونا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ جو قوم مغربی تہذیب کے طوفانوں میں گھر چکی تھی وہ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر اور حواس کو معطل کر کے کب تک طوفان کے وجود سے انکار کرتی اور اس کے اثرات سے محفوظ رہتی؟ جس قوم پر تمدن و تہذیب کا جدید نظام سیاسی طاقت کے ساتھ محیط ہو چکا تھا وہ اپنی عملی زندگی کو مغلوبی و محکومی کی حالت میں اس کے نفوذ و اثر سے کس طرح بچا سکتی؟ آخر کار وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیے تھا۔ سیاست کے میدان میں بھی شکست کھانے کے بعد مسلمانوں نے علم اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی شکست کھائی اور اب ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دنیائے اسلام کے ہر خطہ میں مغربیت کا طوفانِ بلا کی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے، جس کی رو میں بہتے بہتے مسلمانوں کی نئی نسلیں اسلام کے مرکز سے دور، کوسوں دور نکل گئیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علما کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بے گانہ کر رہی ہیں ان پر اظہارِ نفرت تو اُن سے جتنا چاہے کرا لیجیے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو

جدید علمی و عملی مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے اس لیے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علما اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے اُلٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انھوں نے اپنے اوپر گرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں سوچتے ہیں، اسی میں رہتے ہیں اور اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں۔ بلاشبہ علوم اسلامی کے جواہر آج دنیا میں انہی بزرگوں کے دم سے قائم ہیں۔ اور جو کچھ دینی تعلیم پھیل رہی ہے انہی کے ذریعہ سے پھیل رہی ہے۔ لیکن دو سو برس کی جو وسیع خلیج انھوں نے اپنے اور زمانہ حال کے درمیان حائل کر رکھی ہیں وہ اسلام اور جدید دنیا کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں ہونے دیتی۔ جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلام کی تعلیم سے بالکل بیگانہ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علم بردار ہے مگر زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں۔ دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی و ادبی اور سیاسی گاڑی کو چلا رہا ہے، مگر اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف ہے۔ اسلامی تہذیب کی اسپرٹ سے بے گانہ ہے، اسلام کے اجتماعی نظام اور تمدنی قوانین سے ناآشنا ہے۔ صرف دل کے ایک گوشہ میں ایمان کا تصور اہمیت لیے رکھتا ہے باقی تمام حیثیتوں سے اس میں اور ایک غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر چونکہ علمی و عملی طاقت جو کچھ بھی ہے اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے دست و بازو ہیں جو گاڑی چلانے کی قوت رکھتے ہیں اس لیے وہ ملت کی گاڑی کو لے کر گمراہی کی راہوں میں بھٹکتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کو سیدھا راستہ بتائے۔

میں اس حالت کو دیکھ رہا ہوں اور اس کا خوف ناک انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اگرچہ رہنمائی کے لیے جس علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہے وہ مجھ کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکوں لیکن اللہ نے

دل میں ایک درد دیا ہے اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے اس سے کام لے کر مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دوں اور کامیابی و ناکامی سے بے پروا ہو کر اپنی سی کوشش کر دیکھوں۔ کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری کو دیکھ کر اپنی کوششیں خود مجھ کو ہیچ میرز معلوم ہوتی ہیں مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ بھی ہے اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ میرا کام کوشش کرنا ہے اور اپنی حد وسع تک میں اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتا ہوں۔

(ترجمان القرآن، رجب ۱۳۵۴ھ، اکتوبر ۱۹۳۵ء)

انسانی قانون اور الٰہی قانون

دسمبر ۱۹۳۳ کی ابتدا میں امریکہ کے قانونِ تحریم خمر (Prohibition Law) کی تنسیخ کا باقاعدہ اعلان ہوگیا۔ اور تقریباً چودہ برس کے بعد نئی دنیا کے باشندوں نے پھر ''خشکی'' سے ''تری'' کے حدود میں قدم رکھا۔ جمہوریہ امریکہ کی صدارت پر مسٹر روز ویلٹ کا فائز ہونا خشکی پر تری کی فتح کا پہلا اعلان تھا۔ اس کے بعد پہلے تو اپریل ۱۹۳۳ میں ایک قانون کے ذریعہ سے ۲ء۳ فی صدی الکحل کی شراب کو جائز کیا گیا، پھر چند مہینے نہ گزرے تھے کہ دستور جمہوریہ امریکہ کی اٹھارہویں ترمیم ہی منسوخ کردی گئی جس کی رُو سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حدود میں شراب کی خرید وفروخت، درآمد برآمد اور ساخت وپرداخت حرام قرار دی گئی تھی۔

قانون کے ذریعہ سے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا، جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اٹھارہویں ترمیم سے پہلے کئی سال تک اینٹی سیلون لیگ (Anti-Saloon League) رسائل وجرائد، خطبات، تصاویر، میجک، لینٹرن، سنیما اور بہت سے دوسرے طریقوں سے شراب کی مضرتیں اہل امریکہ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی رہی اور اس تبلیغ میں اُس نے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تحریک کی ابتدا سے لے کر ۱۹۲۵ء تک نشر واشاعت پر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوئے اور شراب کے خلاف جس قدر لٹریچر شائع کیا گیا وہ تقریباً ۹/ارب صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کے علاوہ قانونِ تحریم خمر کی تنفیذ کے مصارف کا جس قدر بار گزشتہ چودہ سال میں امریکی قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے اس کی مجموعی مقدار ۶۵ کروڑ پونڈ بتائی جاتی ہے اور حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے محکمۂ عدل نے جنوری ۱۹۲۰ء سے اکتوبر ۱۹۳۳ء تک کے جو اعداد وشمار

شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کی تنفیذ کے سلسلہ میں دو سو آدمی مارے گئے۔ ۵۳۴۳۳۵ قید کیے گئے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کے جرمانے عاید کیے گئے۔ چالیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کی مالیت کی املاک ضبط کی گئیں۔

جان و مال کے یہ ہولناک نقصانات صرف اس لیے برداشت کیے گئے کہ بیسویں صدی کی اس ''مہذب ترین'' قوم کو جس کا آفتابِ علم نصف النہار پر پہنچا ہوا ہے، اُمّ الخبائث کی بے شمار روحانی، اخلاقی، جسمانی اور مالی مضرتوں سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن تحریم سے پہلے کئی سال اور تحریم کے بعد کئی سال کی مسلسل کوشش جن میں حکومت کی طاقت بھی شریک تھی، امریکی قوم کے عزم مے خواری کے آگے ناکام ہوگئیں اور ''تاریخِ عالم کا بڑا اصلاحی جہاد'' آخر کار بے سود ثابت ہوا۔

تحریم خمر کی یہ ناکامی اور قانونِ تحریم کی یہ تنسیخ کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ شراب کی وہ مضرتیں جن کو دور کرنے کے لیے پروپیگنڈا اور قانون کی طاقت استعمال کی گئی تھی، اب منفعتوں سے بدل گئی ہیں، یا کسی نئے علمی اکتشاف نے اُن خیالات کو غلط ثابت کر دیا ہے جو پہلے قائم کیے گئے تھے۔ برعکس اس کے آج پہلے سے بھی زیادہ وسیع وکثیر تجربات کی بنا پر یہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ قحبہ گری، زنا، عملِ قوم لوط، چوری، قمار بازی، قتل وخون اور ایسے دوسرے اخلاقی مفاسد اس ام الخبائث کے قریب ترین رشتہ دار ہیں، اور مغربی اقوام کے اخلاق، صحت، معیشت اور معاشرت کی تباہی میں اس کا بڑا دخل ہے، لیکن اس کے باوجود جس چیز نے آج حکومتِ امریکہ کو اپنا قانون واپس لینے اور حرام کو حلال کر دینے پر مجبور کر دیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ امتِ امریکیہ کی عظیم اکثریت کسی طرح شراب چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی اور وہی پبلک جس کے ووٹ نے اب سے چودہ برس پہلے یہ چیز حرام کی تھی اب اس کو حلال کرنے پر اصرار کرنے لگی۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے مے خواری کے نقصانات سے کسی بڑے سے بڑے حامی شراب نے بھی کبھی انکار نہیں کیا ہے اور نہ کبھی مخالفینِ تحریم نے شراب کے محاسن کی کوئی ایسی فہرست پیش کی جو ان قبائح کے مقابلہ میں کچھ بھی وزن رکھتی ہو۔ جس وقت امریکن کانگریس میں رائے عام کی تائید سے دستور کی اٹھارہویں ترمیم پیش ہوئی تھی اس وقت ''خشکی'' اور ''تری'' کے درمیان ہر طرح موازنہ کرلیا گیا تھا اور انہی تمام مضرتوں اور خرابیوں کا لحاظ کرتے ہوئے کانگریس نے وہ ترمیم پیش کی تھی، ۴۶ ریاستوں نے اس ترمیم کی توثیق کی تھی، دارالمعوثین (House of

(Representative) اور مجلس شیوخ (Senate) نے اس ترمیم کے مطابق قانونِ تحریم (Prohibition Act) پاس کیا تھا۔ یہ سب کچھ امریکی قوم کی مرضی سے ہوا اور جب تک تحریم کا معاملہ کاغذ اور زبان تک رہا قوم خوش خوش اس کی تائید کرتی رہی۔ مگر جوں ہی کہ تحریم عالم معاملہ میں آئی، تمام امتِ امریکیہ کا رنگ بدل گیا۔ اُمّ الخبائث کے ہجر میں پہلی رات بسر کرتے ہی دنیا کی سب سے زیادہ متمدن، ذی علم، ذی ہوش، حقائق پسند، اور ترقی یافتہ قوم دیوانی ہوگئی۔ اور اس نے جوشِ جنوں میں وہ حرکتیں شروع کیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ قوم مشرقی شاعری کے خیالی عاشقوں کی طرح فی الواقع اپنا سر پھوڑ ڈالے گی۔

اجازت یافتہ شراب خانوں کے بند ہوتے ہی تمام ملک میں لکھوکھا خفیہ شراب خانے (Speak-easies and Blind Pigs) قائم ہوگئے جن میں قانون کی گرفت سے بچ کر شراب پینے پلانے، بیچنے اور خریدنے کے عجیب عجیب طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ کسی شخص کا اپنے کسی دوست یا عزیز کو کسی خفیہ شراب خانے اور اس کے مقررہ اشارے (Passwords) کا پتہ دینا ایک خاص مہربانی کا فعل سمجھا جاتا تھا۔ پہلے تو حکومت لائسنس یافتہ شراب خانوں کی تعداد، ان کی شرابوں کی نوعیت اور اُن میں آنے جانے والوں کے حالات کی نگرانی کرسکتی تھی۔ مگر اب یہ بدکاری کے اڈے اس کی نگرانی کے حدود سے آزاد تھے۔ ان کی تعداد قبلِ تحریم کے اجازت یافتہ شراب خانوں سے کئی گنی زیادہ ہوگئی۔ ان میں ہر قسم کی بدترین شرابیں فروخت ہونے لگیں جو صحت کے لیے غایت درجہ مضر تھیں۔ ان میں کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی، جس کے ہولناک نتائج سے ریاست ہائے متحدہ کے اہلِ فکر میں عام اضطراب برپا ہوگیا۔

شراب کی قیمت پہلے سے کئی گنی زیادہ ہوگئی۔ مے فروشی کا پیشہ ایک بڑا پُر منفعت پیشہ بن گیا اور ہزاروں لاکھوں آدمی یہی کاروبار کرنے لگے۔ خفیہ مے خانوں کے علاوہ بہ کثرت پھیری لگانے والے مے فروش (Bootleggers) پیدا ہوگئے جو گویا چلتے پھرتے مے خانے تھے۔ یہ لوگ مدرسوں، دفتروں، ہوٹلوں، تفریح گاہوں حتیٰ کہ لوگوں کے گھروں تک پہنچ کر شراب بیچنے اور نئے نئے گاہک پیدا کرنے لگے۔ کم سے کم اندازہ یہ ہے کہ زمانہ قبلِ تحریم کی بہ نسبت بعدِ تحریم کے زمانہ میں امریکہ کے مے فروشوں کی تعداد دس گنی زیادہ ہوگئی۔ شہروں سے گزر کر دیہات تک میں یہ کاروبار پھیل گیا۔ گاؤں گاؤں میں شراب کشید کرنے کے خفیہ کارخانے قائم ہوگئے۔ تحریم سے

پہلے امریکہ میں عرق کشی کے اجازت یافتہ کارخانوں کی تعداد کل چار سو تھی۔ تحریم کے بعد سات سال کے اندر ۷۹۴۲۷ کارخانے گرفتار ہوئے۔ ۹۳۸۳۱ بھٹیاں پکڑی گئیں اور پھر بھی شراب فروشی کے کاروبار میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ یہ محکمۂ تحریم کے ایک سابق کمشنر کا بیان ہے کہ ''ہم کل کارخانوں اور بھٹیوں کا صرف دسواں حصہ پکڑ سکے۔'' اسی طرح شراب کی مقدار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ تحریم کے زمانہ میں امریکہ کے باشندے ہر سال ۲۰ کروڑ گیلن شراب پینے لگے تھے۔ یہ مقدارِ استعمال قبلِ تحریم کی مقدار سے بہت زیادہ تھی۔

جو شراب اس قدر کثیر مقدار میں استعمال کی جانے لگی تھی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی حد درجہ خراب اور مضرِ صحت تھی۔ اطباء کا بیان ہے کہ:

> ''اس چیز کو شراب کے بجائے زہر کہنا زیادہ صحیح ہے۔ اس کے حلق سے اُترتے ہی معدے اور دماغ پر اس کے زہریلے اثرات مرتب ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ اور دو دن تک اعصاب اُس سے متاثر رہتے ہیں، اس کے نشے میں انسان کسی خوش باشی اور خوش فعلی کے مطلب کا نہیں رہتا بلکہ اس کی طبیعت شورش اور ہنگامہ آرائی اور ارتکابِ جرم کی جانب مائل ہوجاتی ہے۔''

اس قسم کی شرابوں کی کثرتِ استعمال نے اہلِ امریکہ کی جسمانی صحت کو تباہ کر ڈالا۔ مثال کے طور پر شہر نیویارک کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریم سے پہلے ۱۹۱۸ء میں الکحل کے اثرات سے بیمار ہونے والوں کی تعداد ۳۷۴۱ اور مرنے والوں کی تعداد ۲۵۲ تھی۔ ۱۹۲۶ء میں بیمار ہونے والوں کی تعداد گیارہ ہزار اور مرنے والوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچ گئی۔ ان کے علاوہ جو لوگ بالواسطہ شراب کے اثرات سے متاثر ہو کر ہلاک یا زندہ در گور ہوگئے ان کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح جرائم، خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کے جرائم میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ امریکہ کے ججوں کا بیان ہے کہ ''ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کبھی اتنی کثیر تعداد میں بچے بحالت نشہ گرفتار ہوئے ہوں۔'' جب کمسنی کے جرائم حد سے بڑھ گئے تو اس کی تحقیقات کی گئی۔ اور ثابت ہوا کہ ۱۹۲۰ء سے نوجوانوں کی مے خواری اور عربدہ جوئی میں سال بہ سال زیادتی ہوتی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ بعض شہروں میں آٹھ سال کے اندر دو سو فی صدی اضافہ

ہوا۔ ۱۹۳۳ میں امریکہ کی National Crime Council کے ڈائرکٹر کرنل موس (Col. Moos) نے بیان کیا کہ اس وقت امریکہ کے تین آدمیوں میں سے ایک آدمی جرائم پیشہ ہے اور ہمارے ہاں قتل کے جرائم میں ساڑھے تین سو فی صدی اضافہ ہوا ہے۔

غرض چودہ سال کے اندر امریکہ میں تحریم خمر کے جو نتائج ظاہر ہوئے اُن کا خلاصہ یہ ہے:

> قانون کا احترام دلوں سے اٹھ گیا اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں خلاف ورزیِ قانون کی بیماری پھیل گئی۔ تحریم خمر کا اصل مقصد بھی حاصل نہ ہوا، بلکہ اس کے برعکس یہ چیز حرام ہونے کے بعد اس سے بھی زیادہ استعمال ہونے لگی جتنی حلال ہونے کے زمانہ میں استعمال ہوتی تھی۔ قانونِ تحریم کی تنفیذ میں حکومت کا اور خفیہ طریقہ سے شراب خریدنے میں رعایا کا بے حساب مالی نقصان ہوا اور ملک کے معاشی حالات تباہ ہونے لگے۔ امراض کی کثرت، صحت کی بربادی، شرحِ اموات میں اضافہ، اخلاقِ عامہ کا فساد، سوسائٹی کے تمام طبقات اور خصوصاً نوخیز نسلوں میں ذمائم اور قبائح کا بکثرت شائع ہونا، اور جرائم میں غیر معمولی ترقی، یہ اس قانون کے تمدنی و اخلاقی ثمرات تھے۔

یہ نتائج اس ملک میں حاصل ہوئے جو بیسویں صدی کے روشن ترین زمانہ میں مہذب ترین ملک سمجھا جاتا ہے، جس کے باشندے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں اور جن کے دماغ علم و حکمت کی روشنی سے منور ہیں۔ جو اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ نتائج اس حالت میں ظاہر ہوئے جب کہ کروڑ ہا روپیہ صرف کر کے اور کئی ارب رسالے اور کتابیں شائع کر کے تمام قوم کو شراب کے نقصانات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

یہ نتائج اس کے باوجود ظاہر ہوئے کہ امریکی قوم کی ایک بڑی اکثریت تحریم کی ضرورت کو تسلیم کر چکی تھی اور تحریم کا قانون اس کی مرضی سے پیش اور پاس ہوا تھا۔

پھر ان نتائج کا اظہار ایسی حالت میں ہوا جب کہ امریکہ کی عظیم الشان سلطنت بیسویں صدی کی بہترین تنظیم کے ساتھ کامل چودہ سال تک شراب نوشی اور شراب فروشی کا قلع قمع کرنے پر تلی رہی۔

جب تک یہ نتائج ظاہر نہ ہوئے تھے حکومت اور رعیت دونوں کی اکثریت شراب کو حرام قرار دینے پر متفق تھی، اس لیے شراب حرام ہو گئی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ قوم کسی طرح شراب

چھوڑنے پر راضی نہیں ہے، اور زبردستی شراب چھڑانے کا نتیجہ پہلے سے خراب نکلا ہے، تو اسی حکومت اور رعیت کی اکثریت نے شراب کو حلال کرنے پر اتفاق کر لیا۔

اب ذرا ایک نظر اس ملک کی حالت پر ڈال لیجے جو اَب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے تاریک ترین زمانے میں سب سے زیادہ تاریک ملک شمار ہوتا تھا۔ باشندے جاہل، علم و حکمت کا نام و نشان نہیں، تمدن و تہذیب کا پتہ نہیں۔ پڑھے لکھوں کی تعداد شاید دس ہزار میں ایک اور وہ بھی ایسے کہ آج کل کے کم سواد بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہوں گے۔ موجودہ زمانے کے تنظیمی ادارات اور وسائل یکسر مفقود، حکومت کا نظام بالکل ابتدائی حالت میں اور اس کو قائم ہوئے چند سال سے زیادہ نہ ہوئے تھے، باشندوں کا حال یہ کہ شراب کے عاشق، ان کی زبان میں شراب کے تقریباً ڈھائی سو نام پائے جاتے ہیں، جس کی مثال شاید دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہ ملے گی۔ جو شراب کے ساتھ ان کے غیر معمولی شغف کا ثبوت ہے۔ اور اس کا مزید ثبوت ان کی شاعری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور لازمۂ حیات سمجھی جاتی تھی۔

اس حالت میں وہاں شراب کا مسئلہ پیش ہوتا ہے اور رسول خداؐ سے پوچھا جاتا ہے کہ اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ خدا کا ارشاد ہے:

> يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ
> وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ (البقرۃ: ۲۱۹)

> "یہ تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑی خرابی ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔"

یہ کوئی حکم نہ تھا بلکہ محض شراب کی حقیقت بتائی گئی تھی کہ اس میں اچھائی اور برائی دونوں موجود ہیں، مگر بُرائی کا پہلو غالب ہے۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ قوم کے ایک گروہ نے اسی وقت سے مے خواری چھوڑ دی۔ تاہم اکثریت بدستور شراب کی خوگر رہی۔

پھر دوبارہ شراب کے بارے میں حکم پوچھا گیا۔ کیونکہ بعض لوگ نشے کی حالت میں نماز پڑھتے اور غلطیاں کر جاتے تھے۔ اس پر رسول خداؐ نے اپنے خدا کی طرف سے یہ حکم سنایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (النساء: ۴۳)

"اے ایمان لانے والو نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ۔ (نماز تم کو اس حالت میں پڑھنی چاہیے جب کہ) تم جان سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔"

یہ حکم سنتے ہی لوگوں نے مے خواری کے لیے اوقات مقرر کر لیے اور عموماً فجر اور ظہر کے درمیان یا عشاء کے بعد شراب پی جانے لگی تاکہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کی نوبت نہ آئے یا نشے کی وجہ سے نماز نہ ترک کرنی پڑے۔

مگر شراب کی اصلی مضرت ابھی باقی تھی۔ نشے کی حالت میں لوگ فساد برپا کرتے تھے اور خون خرابے تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے پھر خواہش کی گئی کہ شراب کے بارے میں صاف اور قطعی حکم دیا جائے۔ اس پر ارشاد ہوا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝ (المائدۃ: ۹۰-۹۲)

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب شیطان کی ساختہ پرداختہ گندگیاں ہیں۔ لہٰذا تم ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ اس پرہیز سے تم کو فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔ کیا یہ معلوم ہوجانے کے بعد اب تم ان سے باز آؤ گے؟ اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ۔ لیکن اگر تم نے سرتابی کی تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ پیغام کو صاف صاف بیان کردے۔"

یہ حکم آنا تھا کہ وہی شراب کے رسیا اور دختِ رز کے عاشق جو اس چیز کے نام پر جان دیتے تھے، یکایک اس سے نفور ہو گئے۔ تحریمِ شراب کی منادی سنتے ہی شراب کے مٹکے توڑ دیے گئے۔ مدینے کی گلیوں میں شراب کے نالے بہہ گئے۔ ایک محفل میں مے نوشی ہو رہی تھی اور دس گیارہ اصحاب شراب کے نشے میں چور تھے۔ اتنے میں رسول اللہؐ کے منادی کی آواز کانوں میں پہنچی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ اسی نشے کی حالت میں حکمِ خدا کا یہ احترام کیا گیا کہ فوراً شراب کا دور رک گیا اور مٹکے توڑ ڈالے گئے۔ ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ شراب پی رہا تھا۔ منہ سے پیالا لگا ہوا تھا کسی نے آ کر تحریمِ خمر کی آیت پڑھی۔ فوراً پیالہ اس کے لبوں سے الگ ہو گیا۔ اور پھر ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہ اترا۔ اس کے بعد جس کسی نے شراب پی اس کو جوتوں، لکڑیوں، لات، مکوں سے پیٹا گیا۔ پھر چالیس کوڑوں کی سزا دی گئی۔ پھر اس جرم کے لیے اسّی (۸۰) کوڑوں کی سزا مقرر کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب سے مے خواری کا نام و نشان مٹ گیا، پھر اسلام جہاں پہنچا، اس نے قوموں کو آپ سے آپ "خشک" (پرہیزگار) بنا دیا تھی کہ آج بھی جب کہ اسلام کا اثر بہت ضعیف ہو چکا ہے، دنیا میں کروڑوں انسان ایسے بستے ہیں جو "کسی قانونِ تحریم اور کسی نظامِ تعزیری کے بغیر شراب سے بالکل مجتنب ہیں۔ مسلمان قوم میں اگر مردم شماری کر کے دیکھا جائے کہ مے خواروں کی تعداد کا فی صدی اوسط کیا ہے تو شاید یہ قوم اب بھی دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ پرہیزگار پائی جائے گی۔ پھر اس قوم میں جو لوگ شراب پیتے بھی ہیں وہ بھی اس کو گناہ سمجھتے ہیں۔ دل میں اپنے فعل پر نادم ہوتے ہیں، اور بسا اوقات خود بخود تائب ہو جاتے ہیں۔

عقل و حکمت کی مملکت میں آخری فیصلہ تجربہ و مشاہدہ پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ شہادت کبھی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ اب آپ کے سامنے ایک تجربہ امریکہ کا ہے اور دوسرا تجربہ اسلام کا۔ دونوں کا فرق بالکل ظاہر ہے اور یہ آپ کا کام ہے کہ ان کا تقابل کر کے اس سے سبق حاصل کریں۔

امریکہ میں برسوں تک شراب کے خلاف تبلیغ کی گئی۔ کروڑوں روپیہ اس کی مضرتوں کے اعلان و اشتہار پر صرف کیا گیا۔ فنِ طب سے، اعداد و شمار کی شہادتوں سے، عقلی استدلالات سے، اس کی جسمانی، اخلاقی اور معاشی نقصانات اس طرح ثابت کیے گئے کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تصویروں کے ذریعہ سے شراب کی مضرتیں برائی العین مشاہدہ کرا دی گئیں۔ اور پوری کوشش کی گئی کہ لوگ خود اس کی خرابیوں کے قائل ہو کر اس کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر

قوم کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت (کانگریس) نے اکثریت کے ساتھ اس کی تحریم کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے قانون پاس کر دیا۔ پھر حکومت نے (اور اس حکومت نے جو اس وقت دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں سے ہے) اس کی خرید و فروخت، ساخت و پرداخت، درآمد برآمد کو روکنے کے لیے اپنی ساری قوتیں صرف کر ڈالیں۔ مگر قوم (اور وہ قوم جو اس وقت تعلیم یافتہ اور روشن خیال قوموں کی صف اول میں ہے) اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی تو چودہ پندرہ برس کی قلیل مدت ہی میں قانون مجبور ہو گیا کہ حرام کو پھر حلال کر دے۔

دوسری طرف اسلام میں شراب کے خلاف کوئی پروپیگنڈا نہیں کیا گیا۔ نشر و اشاعت پر ایک پیسہ بھی صرف نہ ہوا۔ کوئی اینٹی سیلون لیگ قائم نہیں کی گئی۔ اللہ کے رسولؐ نے بس اتنا کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے شراب حرام کر دی ہے، اور جوں ہی کہ یہ حکم زبان سے نکلا، تمام قوم (اور وہ قوم جو شراب کے عشق میں امریکہ سے بڑھ کر تھی مگر اصطلاحی علم و دانش میں ان سے کوئی نسبت نہ رکھتی تھی) شراب سے باز آ گئی۔ اور ایسی باز آئی کہ جب تک وہ اسلام کے دائرے میں ہے اس کا "خشکی" سے "تری" کی جانب تجاوز کرنا ممکن نہیں ہے۔ "خشکی" کے حصار میں بند رہنے کے لیے وہ کسی حاکمانہ قوت، کسی احتساب اور کسی نظامِ تعزیری کی محتاج نہیں ہے۔ اگر کوئی قوتِ جابرہ موجود نہ ہو تب بھی اس سے باز رہے گی۔ پھر یہ تحریم ایسی تحریم نہیں ہے جس کو کسی طرح تحلیل سے بدلا جا سکتا ہو۔ اگر تمام عالم کے مسلمان بالاتفاق شراب کی تائید میں ووٹ دیں تب بھی یہ حرام کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔

آپ اس عظیم الشان تفاوت کے اسباب پر غور کریں گے تو اس سے چند ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو نہ صرف شراب کے معاملے میں، بلکہ قانون و اخلاق کے تمام مسائل میں اصولِ کلیہ کا حکم رکھتی ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسانی معاملات کی تنظیم میں اسلام اور دنیوی قوانین کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ دنیوی قوانین کا انحصار سراسر انسانی رائے پر ہے اس لیے وہ نہ صرف اپنے کلیات بلکہ ہر ہر جزئیہ میں عوام یا خواص کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں اور انسانی رائے کا (خواہ وہ عوام کی ہو یا خواص کی) حال یہ ہے کہ وہ ہر آن انسانی امیال و عواطف، خارجی اسباب و عوامل، اور علم و عقل کے تغیر پذیر احکام سے (جو ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ صحیح ہوں) متاثر ہوتی

رہتی ہے۔ ان تاثرات سے آراء و افکار میں تغیر ہوتا ہے۔ اس تغیر سے لازمی طور پر اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، حرام اور حلال کے معیارات بدلتے رہتے ہیں اور ان کے بدلنے کے ساتھ ہی قانون کو بھی بدل جانا پڑتا ہے۔ اس طرح اخلاق اور تہذیب کا کوئی پائیدار مستقل، ناقابل تغیر معیار قائم نہیں ہونے پاتا۔ انسان کا تلون قانون پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور قانون کا تلون انسانی زندگی پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نومشق موٹر چلا رہا ہو اور اس کے ناآزمودہ ہاتھ بے قاعدگی کے ساتھ اسٹیرنگ کو کبھی ادھر اور کبھی ادھر گھما رہے ہوں۔ اس کی ان بے قاعدہ گردشوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موٹر کی حرکت بھی بے قاعدہ اور غیر مستقیم ہوگی۔ وہ استقلال کے ساتھ کسی ایک معین راستہ پر نہ چل سکے گی، اور جب وہ آڑی ترچھی رفتار سے چلے گی تو خود چلانے والے حضرات ہی پر اس کا اثر پڑے گا۔ کبھی وہ سیدھے راستہ پر ہوں گے اور کبھی ٹیڑھے راستہ پر۔ کہیں کسی گڑھے میں جا گریں گے۔ کہیں کسی دیوار سے ٹکرائیں گے اور کہیں نشیب و فراز کے دھچکے کھائیں گے۔

بہ خلاف اس کے اسلام میں قانون اور اخلاق کے کلیات تمام تر اور جزئیات بیشتر خدا اور رسولؐ کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ انسانی رائے کو ذرہ برابر ان میں دخل نہیں ہے اور جزئیات میں کسی حد تک دخل ہے بھی تو وہ صرف اس قدر ہے کہ زندگی کے تغیر پذیر حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ان کلی احکام اور جزئی نظائر سے حسبِ موقع نئے جزئیات مستنبط کرتے رہیں، جن کو لازماً اصولِ شرع کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس الٰہی قانون سازی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اخلاق اور تہذیب کا ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر معیار موجود ہے، ہمارے اخلاقی و مدنی قوانین میں تلون کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کل کا حرام آج کا حلال اور کل پھر حرام نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو جو حرام کر دیا گیا وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے اور جو حلال کر دیا گیا وہ قیامت تک حلال ہے۔ ہم نے اپنی موٹر کار کا اسٹیرنگ ایک ماہر کامل کے ہاتھ میں دے دیا ہے، اب ہم مطمئن ہیں کہ وہ موٹر کو سیدھے رستے پر چلائے گا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ (ابراہیم: ۲۷)

"اللہ ایمان لانے والوں کو ایک پکی بات کے ذریعے سے دنیا اور آخرت کی زندگی میں ثبات اور قرار بخشتا ہے، اور نافرمان ظالموں کو آوارہ کر دیتا ہے کہ کہیں جم نہیں سکتے۔"

اس میں ایک دوسرا اہم نکتہ بھی ہے۔ دنیوی طاقتیں انسانی زندگی کے لیے ضوابط بنانے اور اخلاق، معاشرت اور تمدن کی اصلاح کرنے کے لیے ہمیشہ اس کی محتاج رہتی ہیں کہ ہر جزئی معاملہ میں پہلے عوام کو اصلاح کے لیے راضی کریں پھر عمل کی جانب قدم بڑھائیں۔ ان کے قوانین کی ہر دفعہ اپنے نفاذ کے لیے عامۂ خلائق کی رضا پر منحصر ہوا کرتی ہے اور جس اصطلاحی یا تنظیمی قانون کا نفاذ عوام کی رضا کے خلاف کر دیا گیا ہو اسے بعد از خرابی ہائے بسیار منسوخ کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہ صرف امریکہ کا تجربہ ہے بلکہ دنیا کے تمام تجربات اس بات پر شہادت دے رہے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیوی قوانین درحقیقت اصلاح اخلاق و معاشرت کے معاملہ میں قطعاً ناکارہ ہیں۔ وہ جن بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں انہی کی رضا پر ان قوانین کا منظور یا نامنظور ہونا اور نافذ یا منسوخ ہو جانا منحصر ہے۔

اسلام نے اس اشکال کو ایک دوسرے طریقہ سے حل کیا ہے اور آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس مشکل کا کوئی حل بجز اس کے نہیں ہے۔ وہ تمدن، معاشرت اور اخلاق کے مسائل کو چھیڑنے اور قوانین شریعت کی اطاعت کا مطالبہ کرنے سے پہلے انسان کو دعوت دیتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لے آئے۔ یہ بات یقیناً انسان کی رضا پر منحصر ہے کہ وہ ایمان لائے یا نہ لائے۔ مگر جب وہ ایمان لے آیا تو اس کی رضا و عدم رضا کا کوئی سوال باقی نہ رہا۔ اب خدا کی طرف سے اس کا رسول جو بھی حکم دے اور خدا کی کتاب جو قانون مقرر کرے وہ اس کے لیے واجب الاطاعت ہے۔ اس ایک اصل کے قائم ہو جانے کے بعد شریعت اسلامی کے تمام قوانین اس پر نافذ ہو جائیں گے اور کسی جزئی یا کلی مسئلہ میں اس کی رضامندی یا نارضامندی کا دخل نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جو کام کروڑوں اربوں روپے کے صرف اور بے نظیر تبلیغ و اشاعت اور حکومت کی زبردست کوششوں کے باوجود نہ ہو سکا وہ عالم اسلامی میں خدا کی جانب سے رسول خدا کی صرف ایک منادی سے ہو گیا۔

تیسری سبق آموز بات یہ ہے کہ کوئی انسانی جماعت خواہ کتنی ہی علوم و فنون کی روشنی سے بہرہ ور ہو، اور خواہ عقلی ترقیات کے آسمان ہی پر کیوں نہ پہنچ جائے، اگر وہ الٰہی قوانین کی تابع

فرمان نہ ہو اور ایمان کی قوت نہ رکھتی ہو تو کبھی ہوائے نفس کے چنگل سے نہیں نکل سکتی۔ اس پر خواہشات نفسانی کا غلبہ اتنا شدید ہوگا کہ جس چیز پر اس کا نفس مائل ہوگا اس کی مضرتیں اگر آفتاب سے بھی زیادہ روشن کر کے دکھا دی جائیں، اگر اس کے خلاف سائنس (یعنی پرستاران عقل کے معبود) کو بھی گواہ بنا کر لا کھڑا کیا جائے، اگر اس کے مقابلہ میں اعداد و شمار کی بھی شہادت پیش کر دی جائے (جو ارباب حکمت کی نگاہ میں ہرگز جھوٹی نہیں ہو سکتی) اگر اس کی خرابیاں تجربہ و مشاہدہ سے بھی ثابت کر دی جائیں تب بھی وہ کبھی اپنے نفس کے معشوق کو نہ چھوڑے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں محاسن اخلاق پیدا کرنا اور اس کے ضمیر کی تشکیل کرنا اور اس میں اتنی طاقت بھر دینا کہ وہ نفس پر غالب آ جائے، نہ علم و حکمت کے بس کی بات ہے اور نہ عقل و خرد کی۔ یہ کام بجز ایمان کے اور کسی چیز کے ذریعے سے انجام نہیں پا سکتا۔

(ترجمان القرآن، شوال ۱۳۵۲ھ، جنوری ۱۹۳۴ء)

مغربی تہذیب کی خودکشی

سیاست، تجارت، صنعت وحرفت اور علوم وفنون کے میدانوں میں مغربی قوموں کے حیرت انگیز اقدامات کو دیکھ کر دل اور دماغ سخت دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید ان قوموں کی ترقی لازوال ہے، دنیا پر اُن کے غلبہ اور تسلط کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے، ربع مسکوں کی حکومت اور عناصر کی فرماں روائی کا انھیں ٹھیکہ دے دیا گیا ہے۔ اور ان کی طاقت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی ہے کہ کسی کے اکھاڑے نہیں اُکھڑ سکتی۔

ایسا ہی گمان ہر زمانہ میں ان سب قوموں کے متعلق کیا جا چکا ہے جو اپنے اپنے وقت کی غالب قومیں تھیں۔ مصر کے فراعنہ، عرب کے عاد وثمود، عراق کے کلدانی، ایران کے اکاسرہ، یونان کے جہانگیر فاتح، روم کے عالمگیر فرماں رواں، مسلمانوں کے جہاں کشا مجاہد، تاتار کے عالم سوز سپاہی۔ سب اس کرۂ خاکی کے اسٹیج پر اسی طرح غلبہ وقوت کے تماشے دکھا چکے ہیں۔ ان میں سے جس جس کے کھیل کی باری آئی، اس نے اپنی چلت پھرت کے کرتب دکھا کر اسی طرح دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہر قوم جب اٹھی ہے تو وہ اسی طرح دنیا پر چھا گئی ہے۔ اسی طرح اس نے چار دانگ عالم میں اپنی شوکت وجبروت کے ڈنکے بجائے ہیں۔ اسی طرح دنیا نے مبہوت ہو کر گمان کیا ہے کہ ان کی طاقت لازوال ہے۔ مگر جب ان کی اجل پوری ہوگئی اور حقیقت میں لازوال طاقت رکھنے والے فرماں روا نے ان کے زوال کا فیصلہ صادر کر دیا۔ تو وہ ایسے گرے کہ اکثر تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئے۔ اور بعض کا نام ونشان اگر دنیا میں باقی رہا بھی تو وہ اس طرح کہ وہ اپنے محکوموں کے محکوم ہوئے۔ اپنے غلاموں کے غلام بنے، اپنے مغلوبوں کے مغلوب ہو کر رہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۷)

’’تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام وہدایات کو) جھٹلایا۔‘‘

کائنات کا نظام کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں سکون اور ٹھہراؤ نہیں ہے، ایک پیہم حرکت، تغیر اور گردش ہے، جو کسی چیز کو ایک حالت پر قرار نہیں لینے دیتی۔ ہر کون کے ساتھ ایک فساد ہے، ہر بناؤ کے ساتھ ایک بگاڑ ہے، ہر بہار کے ساتھ ایک خزاں ہے۔ ہر چڑھاؤ کے ساتھ ایک اتار ہے، اور اسی طرح اس کا عکس بھی ہے۔ ایک ماشہ بھر کا دانہ آج ہوا میں اڑا اڑا پھرتا ہے، کل وہی زمین میں استحکام حاصل کر کے تناور درخت بن جاتا ہے۔ پرسوں وہی سوکھ کر پیوند خاک ہو جاتا ہے اور فطرت کی نمو بخشنے والی قوتیں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے بیج کی پرورش میں لگ جاتی ہیں۔ یہ زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ انسان جب ان میں سے کسی ایک حالت کو زیادہ طویل مدت تک جاری رہتے ہوئے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے۔ اگر اتار ہے تو سمجھتا ہے کہ اتار ہی رہے گا۔ اگر چڑھاؤ ہے تو خیال کرتا ہے کہ چڑھاؤ ہی رہے گا۔ لیکن یہاں فرق جو کچھ بھی ہے دیر اور سویر کا ہے۔ دوام کسی حالت کو بھی نہیں ہے۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ (آل عمران: ۱۴۰)

’’یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔‘‘

دنیا کے حالات ایک طرح کی حرکت میں گردش کر رہے ہیں۔ پیدائش اور موت، جوانی اور بڑھاپا، قوت اور ضعف، بہار اور خزاں، شگفتگی اور پژمردگی، سب اسی گردش کے مختلف پہلو ہیں۔ اس گردش میں باری باری سے ہر چیز پر ایک دور اقبال کا آتا ہے جس میں وہ بڑھتی ہے، پھیلتی ہے، قوت اور زور دکھاتی ہے، حسن اور بہار کی نمائش کرتی ہے، حتیٰ کہ اپنی ترقی کی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ پھر ایک دوسرا دور آتا ہے جس میں وہ گھٹتی ہے۔ مرجھاتی ہے، ضعف اور ناتوانی میں مبتلا ہوتی ہے، اور آخر کار وہی قوتیں اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی تھی۔

یہ اپنی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ اور دنیا کی سب چیزوں کے مانند یہی سنت

انسان پر بھی جاری ہے، خواہ اس کو فرد کی حیثیت سے لیا جائے یا قوم کی حیثیت سے۔ ذلت اور عزت، عسر اور یسر، تنزل اور ترقی، اور ایسی ہی دوسری تمام کیفیات اسی دوری حرکت کے ساتھ مختلف افراد اور مختلف قوموں میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ باری باری سے سب پر یہ دور گزرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس تقسیم میں کلیتاً محروم رکھا گیا ہے یا جس پر کسی ایک کیفیت کو دوام بخشا گیا ہو۔ عام اس سے کہ وہ اقبال کی کیفیت ہو یا ادبار کی۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب: ۶۲)

''یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آ رہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

روئے زمین کے چپے چپے پر ہم کو ان قوموں کے آثار ملتے ہیں جو ہم میں سے پہلے ہو گزری ہیں۔ وہ اپنے تمدن و تہذیب، اپنی صنعت و کاری گری، اپنی ہنرمندی و چابک دستی کے ایسے نشانات دنیا میں چھوڑ گئی ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کی ترقی یافتہ اور غالب قوموں سے وہ کچھ کم نہ تھیں بلکہ اپنے ہم عصروں پر اُن کا غلبہ کچھ ان سے زیادہ تھا۔

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا (الروم: ۹)

''وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، انھوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انھوں نے نہیں کیا ہے۔''

مگر پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ اقبال سامنے دیکھ کر وہ دھوکا کھا گئے۔ نعمتوں کی بارش نے ان کو غرہ میں ڈال دیا۔ خوش حالی ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ غلبہ اور حکومت سے مغرور ہو کر وہ جبار و قہار بن بیٹھے۔ انھوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے نفس پر آپ ظلم کرنا شروع کر دیا۔

وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (ھود: ۱۱۶)

''ظالم لوگ تو انھی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انھیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔''

خدا نے اُن کی سرکشی کے باوجود اُن کو ڈھیل دی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ (الحج: ۴۸)

''کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظالم تھیں، میں نے پہلے ان کو مہلت دی، پھر پکڑ لیا اور سب کو واپس تو میرے ہی پاس آنا ہے۔''

اور یہ ڈھیل بھی کچھ معمولی ڈھیل نہ تھی۔ بعض قوموں کو صدیوں تک یوں ہی ڈھیل دی جاتی رہی۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج: ۴۷)

''تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔''

مگر ہر مہلت اُن کے لیے ایک نیا فتنہ بن گئی۔ وہ سمجھے کہ خدا ان کی تدبیروں کے مقابلہ میں عاجز آ گیا ہے، اور اب دنیا پر خدا کی نہیں ان کی حکومت ہے۔ آخر کار قہرِ الٰہی بھڑک اٹھا اُن کی طرف سے نظرِ عنایت پھر گئی۔ اقبال کے بجائے ادبار کا دور آ گیا۔ ان کی چالوں کے مقابلہ میں خدا بھی ایک چال چلا۔ مگر خدا کی چال ایسی تھی کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ پھر اس کا توڑ کہاں سے کرتے؟

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (النمل: ۵۰)

''یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی، جس کی انھیں خبر نہ تھی۔''

خدا کی چال سامنے سے نہیں آتی، خود انسان کے اندر سے اس کے دل و دماغ اور دل میں سرایت کر کے اپنا کام کرتی ہے۔ وہ انسان کی عقل، اس کے شعور، اس کی تمیز، اس کی فکر، اس کے حواس پر حملہ کرتی ہے۔ وہ اس کے دل کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے۔ وہ اس کو آنکھوں کا اندھا نہیں بلکہ عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج: ۴۶)

''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

اور جب اس کے دل کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں تو ہر تدبیر جو اپنی بہتری کے لیے سوچتا ہے، وہ الٹی اس کے خلاف پڑتی ہے۔ ہر قدم جو وہ کامیابی کے مقصود کی طرف بڑھاتا ہے، وہ اس کو

ہلاکت کے جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کی ساری قوتیں خود اس کے خلاف بغاوت کر دیتی ہیں، اور اس کے اپنے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾

(النمل:٥١)

''اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔''

اس اقبال و ادبار کا ایک مکمل نقشہ ہم کو آلِ فرعون اور بنی اسرائیل کے قصے میں ملتا ہے۔ اہلِ مصر جب ترقی کے انتہائی مدارج کو پہنچ گئے، تو انھوں نے ظلم و سرکشی پر کمر باندھی۔ ان کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، اور ایک کمزور قوم بنی اسرائیل کو جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں وہاں جا کر آباد ہوگئی تھی حد سے زیادہ جور و ستم کا تختۂ مشق بنایا۔ آخر کار اس کی اور اہلِ مصر کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو خدا نے ارادہ کیا کہ اُن کو نیچا دکھائے اور اسی ضعیف قوم کو سر بلند کرے جس کو وہ ہیچ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اللہ کا ارادہ پورا ہوا، اس ضعیف قوم میں حضرت موسیٰ پیدا کیے گئے ان کو خود فرعون کے گھر میں خود اس کے ہاتھوں سے پرورش کرایا گیا اور انھیں اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ انھوں نے فرعون کو نرمی کی راہ سے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ خدا کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو مسلسل تنبیہیں کی گئیں۔ قحط پر قحط پڑے۔ طوفان پر طوفان آئے۔ خون برسا۔ ٹڈی دل اُن کے کھیتوں کو چاٹ گئی۔ جوؤں اور مینڈکوں نے ان کو خوب ستایا مگر ان کے تکبر میں فرق نہ آیا۔

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ (یونس:٧٥)

''انھوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔''

جب تمام حجتیں ایک ایک کر کے ختم ہو چکیں تو عذابِ الٰہی کا فیصلہ نافذ ہوگیا۔ خدا کے حکم سے حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل گئے۔ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا اور مصر کی طاقت ایسی تباہ ہوئی کہ صدیوں تک نہ اُبھر سکی۔

فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ (القصص:٤٠)

''آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔''

پھر بنی اسرائیل کی باری آئی۔ مصری قوم کو گرانے کے بعد کائنات کے حقیقی فرماں روا نے اس قوم کو زمین کی حکومت بخشی جو دنیا میں ذلیل و خوار تھی۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ بِمَا صَبَرُوْا ۭ (الاعراف:١٣٧)

''ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا، کیوں کہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا۔''

اور اس کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت عطا فرمائی۔

وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ (البقرہ:٤٧)

''میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی۔''

مگر یہ فضیلت اور وراثت ارضی حسن عمل کی شرط کے ساتھ مشروط تھی۔ حضرت موسیٰ کی زبان سے پہلے ہی کہلوا دیا تھا کہ تم کو زمین کی خلافت دی تو ضرور جائے گی مگر اس بات پر بھی نظر رکھی جائے گی کہ تم کیسے عمل کرتے ہو (كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ)۔ اور یہ وہ شرط ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ جس قوم کو بھی زمین کی حکومت دی جاتی ہے اس پر یہی شرط لگا دی جاتی ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾

(یونس:١٤)

''ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

پس جب بنی اسرائیل نے اپنے رب سے سرکشی کی، اس کے کلام میں تحریف کی، حق کو باطل سے بدل دیا، حرام خوری، جھوٹ، بے ایمانی اور عہد شکنی کا شیوہ اختیار کیا، زبردست حریص،

بزدل اور آرام طلب بن گئے۔ اپنے انبیا کو قتل کیا۔ حق کی طرف بلانے والوں سے دشمنی کی، ائمۂ خیر سے منہ موڑا، ائمۂ شر کی اطاعت اختیار کی تو ربّ العالمین کی نظر اُن کی طرف سے پھر گئی۔ ان سے زمین کی وراثت چھین لی گئی۔ اُن کو عراق، یونان اور روم کے جابر سلاطین سے پامال کرایا گیا۔ ان کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ ان کو ذلت وخواری کے ساتھ ملک ملک کی خاک چھنوائی۔ حکومت کا استحکام ہمیشہ کے لیے ان سے چھین لیا گیا۔ ہزاروں برس سے وہ خدا کی لعنت میں ایسے گرفتار ہوئے ہیں کہ دنیا میں ان کو عزت کا ٹھکانا نہیں ملتا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (البقرہ:۶۱)

"آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت وخواری اور پستی وبدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

آج اسی سنت الٰہی کا اعادہ پھر ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے، جس کی شامتِ اعمال میں پچھلی قومیں گرفتار ہوئی تھیں۔ اسی شامت نے آج مغربی قوموں کو آن پکڑا ہے۔ جتنی تنبیہیں ممکن تھیں وہ سب اُن کو دی جا چکی ہیں۔ جنگِ عظیم کے مصائب، معاشی مشکلات، بے کاری کی کثرت، امراض خبیثہ کی شدت، نظام عالمی کی برہمی، یہ سب کھلی ہوئی روشن آیات ہیں جن سے وہ اگر آنکھیں رکھتے تو معلوم کر سکتے تھے کہ ظلم، سرکشی، نفس پرستی، اور حق فراموشی کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان آیات سے سبق نہیں لیتے۔ حق سے منہ موڑنے پر برابر اصرار کیے جا رہے ہیں۔ ان کی نظر علتِ مرض تک نہیں پہنچتی۔ وہ صرف آثارِ مرض کو دیکھتے ہیں اور انھی کا علاج کرنے میں اپنی ساری تدابیر صرف کر رہے ہیں۔ اسی لیے جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب حالات کہہ رہے ہیں کہ تنبیہوں اور حجتوں کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اور آخری فیصلہ کا وقت قریب ہے۔

قدرتِ الٰہی نے دو زبردست شیطان مغربی قوموں پر مسلط کر دیے ہیں، جو اُن کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچے لیے چلے جا رہے ہیں۔ ایک قطعِ نسل کا شیطان ہے اور دوسرا قوم پرستی کا شیطان، پہلا شیطان اُن کے افراد پر مسلط ہے، اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر۔ پہلے نے اُن کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں۔ وہ خود اُن کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کرا رہا ہے۔ وہ انھیں منعِ حمل کی تدبیریں سمجھاتا ہے۔ اسقاطِ حمل

پر آمادہ کرتا ہے۔ عملِ تعقیم (Sterilisation) کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی قوتِ تولید کا بیج ہی مار دیتے ہیں۔ انھیں اتنا شقی القلب بنا دیتا ہے کہ وہ بچوں کو آپ ہلاک کر دیتے ہیں۔ غرض یہ شیطان وہ ہے جو بتدریج اُن سے خودکشی کرا رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے اُن کے بڑے بڑے سیاسی مدبروں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خود غرضی، مسابقت، منافرت، عصبیت اور حرص وطمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ وہ اُن کو مخاصم اور معاند گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھاتا ہے کہ یہ بھی عذابِ الٰہی کی ایک صورت ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (الانعام:۶۵)

"(اللہ اس پر قادر ہے کہ) تمھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے۔"

وہ اُن کو ایک بڑی زبردست خودکشی کے لیے تیار کر رہا ہے جو تدریجی نہیں بلکہ آنی ہو گی۔ اُس نے تمام دنیا میں بارود کے خزانے جمع کر دیے ہیں اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے۔ جونہی اس کا وقت آیا وہ کسی خزانۂ بارود کو شبانہ دکھا دے گا اور پھر آن کی آن میں وہ تباہی نازل ہو گی، جس کے آگے تمام پچھلی قوموں کی تباہیاں ہیچ ہو جائیں گی۔

یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ یورپ، امریکہ اور جاپان میں آئندہ جنگ کے لیے جس قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں اُن کو دیکھ دیکھ کر خود اُن کے اہلِ بصیرت لرز رہے ہیں اور اس جنگ کے نتائج کا تصور کر کے اُن کے حواس باختہ ہوئے جاتے ہیں۔ حال میں سرجل نیومان (Sergel Newman) نے جو پہلے امریکہ کے ملٹری اسٹاف کا ایک رکن تھا، آئندہ جنگ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ آئندہ جنگ محض فوجوں کی لڑائی نہیں ہو گی بلکہ اُسے ایک قتلِ عام کہنا چاہیے، جس میں عورتوں اور بچوں تک کو نہ چھوڑا جائے گا۔ سائنس دانوں کی عقل نے جنگ کا کام سپاہیوں سے چھین کر کیمیاوی مرکبات اور بے روح آلات کے سپرد کر دیا ہے، جو مقاتل (Combatant) اور غیر مقاتل (Non-Combatant) میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ اب محارب طاقتوں کی لڑائی میدانوں اور قلعوں میں نہیں بلکہ شہروں اور بستیوں میں ہو گی، کیونکہ جدید نظریہ کے مطابق غنیم کی اصلی قوت فوجوں

میں نہیں بلکہ اس کی آبادیوں، اس کی تجارتی منڈیوں اور صنعتی کارگاہوں میں ہے۔اب ہوائی جہازوں سے طرح طرح کے بم برسائے جائیں گے جن سے آتش فشاں مادّے، زہریلی ہوائیں، امراض کے جراثیم نکل کر وقتِ واحد میں لاکھوں کی آبادی کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ان میں سے ایک قسم کے بم (Lewsite Bombs) ایسے ہیں جن کا ایک گولہ لندن کی بڑی سے بڑی عمارت کو پارہ پارہ کرسکتا ہے۔ایک زہریلی ہوا (Green Grass Gas) کے نام سے موسوم ہے، جس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کو سونگھے گا وہ ایسا محسوس کرے گا گویا پانی میں ڈوب گیا ہے۔ایک دوسری قسم کی زہریلی ہوا (Yellow Grass) میں سانپ کے زہر کی سی خاصیت ہے اور اس کے سونگھنے سے بالکل وہی اثرات ہوتے ہیں جو سانپ کے زہر کی سی خاصیت ہے اور اس کے سونگھنے سے بالکل وہی اثرات ہوتے ہیں جو سانپ کے کاٹے سے ہوتے ہیں۔اسی قسم کی بارہ زہریلی ہوائیں اور بھی ہیں جو تقریباً غیر مرئی ہیں۔ان کے اثرات ابتداءً بالکل محسوس نہیں ہوتے اور جب محسوس ہوتے ہیں تو تدبیر علاج کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ان میں سے ایک خاص ہوا ایسی ہے جو بہت بلندی پر پہنچ کر پھیل جاتی ہے اور جو ہوائی جہاز اس کے حلقہ سے گزرتا ہے اس کا چلانے والا یک اندھا ہو جاتا ہے۔اندازہ کیا گیا ہے کہ بعض زہریلی ہوائیں اگر ایک ٹن کی مقدار میں شہر پیرس پر چھوڑ دی جائیں تو ایک گھنٹہ کے اندر کلیتاً تباہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ ایسا کام ہے جس کو انجام دینے کے لیے صرف سو (۱۰۰) ہوائی جہاز کافی ہیں۔

حال میں ایک برقی آتش فشاں گولہ ایجاد کیا گیا ہے جس کا وزن صرف ایک کیلوگرام ہوتا ہے۔مگر اتنے سے گولہ میں یہ قوت ہے کہ جب کسی چیز سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو دفعتاً تین ہزار درجہ فارن ہیٹ کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایسی آگ بھڑک اُٹھتی ہے جو کسی چیز سے بجھائی نہیں جاسکتی۔پانی اس کے حق میں پٹرول ثابت ہوا ہے اور ابھی تک سائنس اس کے بجھانے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں کرسکا ہے۔خیال یہ ہے کہ ان کو شہروں کے بڑے بڑے بازاروں پر پھینکا جائے گا تاکہ اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ جائے۔پھر جب لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگیں گے تو ہوائی جہازوں سے زہریلی ہواؤں کے بم برسائے جائیں گے جن سے تباہی کی تکمیل ہو جائے گی۔

ان ایجادات کو دیکھ کر ماہرینِ فن نے اندازہ لگایا ہے کہ چند ہوائی جہازوں سے دنیا

کے بڑے سے بڑے اور محفوظ دار السلطنت کو دو گھنٹوں میں پیوندِ خاک کیا جاسکتا ہے۔لاکھوں کی آبادی کو اس طرح مسموم کیا جاسکتا ہے کہ رات کو اچھے خاصے سوئیں اور صبح کو ایک بھی زندہ نہ اُٹھے۔زہریلے مادّوں سے ایک پورے ملک میں پانی کے ذخائر کو مسموم، مواشی اور حیوانات کو ہلاک، کھیتوں، اور باغوں کو غارت کیا جاسکتا ہے۔ان تباہ کن حملوں کی مدافعت کا کوئی موثر ذریعہ ابھی ایجاد نہیں ہوا ہے۔بجز اس کے کہ دونوں محارب فریق ایک دوسرے پر اسی طرح حملہ کریں اور دونوں ہلاک ہو جائیں۔

یہ آئندہ جنگ کی تیاریوں کا ایک مختصر بیان ہے، اگر آپ تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں تو کتاب What would be the character of a new war ملاحظہ کیجیے جو جنیوا کی انٹر پارلیمینٹری یونین نے باقاعدہ تحقیقات کے بعد شائع کی ہے۔اس کو پڑھ کر آپ اندازہ کرلیں گے کہ مغربی تہذیب نے کس طرح اپنی ہلاکت کا سامان اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے۔اب اس کی عمر کا امتداد صرف اعلانِ جنگ کی تاریخ تک ہے، جس روز دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ چھڑی اس روز سمجھ لیجیے کہ مغربی تہذیب کی تباہی کے لیے خدا کا فیصلہ صادر ہو چکا۔ کیونکہ دو بڑی سلطنتوں کے میدان میں اترنے کے بعد کوئی چیز جنگ کو عالمگیر ہونے سے نہیں بچاسکتی۔اور جب جنگ عالمگیر ہوگی تو تباہی بھی عالمگیر ہوگی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ
بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾ (الروم:۴۱)

"لوگوں کے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد رونما ہوگیا ہے تاکہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید وہ اب بھی رجوع کریں۔"

بہر حال اب قریب ہے کہ وراثت ارضی کا نیا بندوبست ہو، اور ظالمین و مسرفین کو گرا کر کسی دوسری قوم کو (جو غالباً مستضعفین ہی میں سے ہوگی) دنیا کی خلافت پر سرفراز کیا جائے۔ دیکھنا ہے کہ اس مرتبہ حضرتِ حق کی نظرِ انتخاب کس پر پڑتی ہے۔

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آئندہ کون سی قوم اٹھائی جائے گی۔

یہ اللہ کی دین ہے جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران:۲۶)

"کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔"

مگر اس معاملہ میں بھی اس کا ایک قانون ہے جسے اس نے اپنی کتاب عزیز میں بیان فرمادیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کو جب وہ اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے گراتا ہے تو اس کی جگہ کسی ایسی قوم کو اٹھاتا ہے جو اس مغضوب قوم کی طرح بدکار اور اس کے مانند سرکش نہ ہو۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (محمد:۳۸)

"اگر تم نے روگردانی کی تو تمھارے بجائے کسی اور قوم کو اٹھائے گا پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔"

اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو کمزور اور مغلوب النفس قومیں مغربی تہذیب کی نقالی کر رہی ہیں اور فرنگی اقوام کے محاسن کو (جو تھوڑے بہت ان میں باقی رہ گئے ہیں) اختیار کرنے کے بجائے ان کے معائب اختیار کر رہی ہیں (جو اُن کے مغضوب ہونے کی علت ہیں) ان کے لیے آئندہ انقلاب میں کامیابی و سرفرازی کا کوئی موقع نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاخری ۱۳۵۲ھ، اکتوبر ۱۹۳۲ء)

لارڈ لوتھین کا خطبہ

جنوری کے آخری ہفتہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کانووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کے موقع پر لارڈ لوتھین نے جو خطبہ دیا ہے، وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ہندستان کے تعلیم یافتہ —— جدید اور قدیم دونوں —— اس کو گہری نظر سے دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ اس خطبہ میں ایک ایسا آدمی ہمارے سامنے اپنے دل و دماغ کے پردے کھول رہا ہے جس نے علومِ جدیدہ اور ان کی پیدا کردہ تہذیب کو دور سے نہیں دیکھا ہے بلکہ خود اس تہذیب کی آغوش میں جنم لیا ہے اور اپنی زندگی کے ۵۶ سال اسی سمندر کی غواصی میں گزارے ہیں۔ وہ پیدائشی اور خاندانی یورپین ہے، آکسفورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، "راؤنڈ ٹیبل" جیسے مشہور رسالے کا ایڈیٹر رہ چکا ہے اور قریب قریب ۲۱ سال سے سلطنت برطانیہ کے مہمات امور میں ذمہ دارانہ حصہ لیتا رہا ہے۔ وہ کوئی بیرونی ناظر نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب کے اپنے گھر کا آدمی ہے اور وہ ہم سے بیان کرتا ہے کہ اس گھر میں اصل خرابیاں کیا ہیں، کس وجہ سے ہیں اور اس کے گھر کے لوگ اس وقت درحقیقت کس چیز کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

ایک حیثیت سے یہ خطبہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سبق آموز ہے کیونکہ اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ مغربی علوم اور ان کی پیدا کردہ تہذیب نری تریاق ہی تریاق نہیں ہے بلکہ اس میں بہت کچھ زہر بھی ملا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے اس معجون کو بنایا اور صدیوں استعمال کیا وہ آج خود آپ کو آگاہ کر رہے ہیں کہ خبردار اس معجون کی پوری خوراک نہ لینا۔ یہ ہمیں تباہی کے کنارے پہنچا چکی ہے اور تمہیں بھی تباہ کر کے رہے گا۔ ہم خود اس تریاقِ خالص کے محتاج ہیں۔ اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں، مگر گمان ضرور ہوتا ہے کہ وہ تریاق تمہارے پاس موجود ہے

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تریاق کو خاک میں ملا کر ہماری اس زہر آلود معجون کے مزے پر لگ جاؤ۔

دوسری حیثیت سے اس خطبہ میں ہمارے علما اور مذہبی طبقوں کے لیے بھی کافی سامانِ بصیرت ہے۔ اس سے وہ اندازہ کرسکیں گے کہ اس وقت جس دنیا میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے سامنے اسلامی تعلیمات کے کن پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کئی صدیوں سے مادہ پرستی کی تہذیب کا تجربہ کر رہی ہے اور اب اس سے تھک چکی ہے۔ صدیوں پہلے روحِ تحقیق اور آزادیٔ فکر کا جو تریاق ہم نے اہلِ فرنگ کو بہم پہنچایا تھا۔ اس کو خود انھوں نے محض نادانستگی میں لامذہبی اور مادیت کے زہر سے آلودہ کردیا اور دونوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی معجون تیار کی ہے۔ اس معجون کا تریاق اپنے زور سے انھیں ترقی کے آسمان پر اٹھالے گیا۔ مگر اس کا زہر بھی برابر اپنا کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اب اس تریاق پر زہر کا اثر پوری طرح غالب ہو چکا ہے۔ اس کے نتائج کو خوب اچھی طرح بھگت لینے کے بعد اب وہ پھر تریاق کی مزید خوراک کے لیے چاروں طرف نظر دوڑا رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی معجون میں زہریلے اجزا کون کون سے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان اجزا کے ملنے سے ان کی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ وہ اب یہ بھی صاف طور سے محسوس کر رہے ہیں کہ ان اثرات کو دور کرنے کے لیے کس قسم کا تریاق انھیں درکار ہے۔ مگر صرف یہ بات ان کو معلوم نہیں کہ جس تریاق کے وہ طالب ہیں وہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں اور یہ آخری خوراک بھی ان کو اسی دواخانہ سے ملے گی جہاں سے پہلی خوراک ملی تھی۔ اس مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد بھی اگر وہ تریاق کے لیے بھٹکتے رہیں اور اُسے نہ پاکر زہر سے ساری دنیا کو مسموم کیے چلے جائیں تو اس گناہِ عظیم میں ان کے ساتھ علماء اسلام بھی برابر کے شریک ہوں گے۔ علما کے لیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات اور فقہی جزئیات کے بحثوں میں لگے رہیں۔ رسول اللہؐ کو علم غیب تھا یا نہ تھا؟ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ رسول کا نظیر ممکن ہے یا نہیں؟ ایصالِ ثواب اور زیارتِ قبور کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ آمین بالجہر و رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ مسجد میں منبر و محراب کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل جن کو طے کرنے میں آج ہمارے پیشوایانِ دین اپنی ساری قوتیں ضائع کر رہے ہیں، دنیا کے لیے کوئی اہمیت نہیں اور ان کے طے ہو جانے سے ہدایت و ضلالت کی اس عظیم الشان لڑائی کا تصفیہ نہیں ہو سکتا جو اس

وقت تمام عالم میں چھڑی ہوئی ہے۔ آج اصلی ضرورت ان مسائل کے سمجھنے کی ہے جو ناخداشناسی اور لادینی کی بنیاد پر علم و تمدن کے صدیوں تک نشوونما پاتے رہنے سے پیدا ہوگئے ہیں۔ ان کی پوری پوری تشخیص کر کے اصولِ اسلام کے مطابق ان کا قابلِ عمل حل پیش کرنا وقت کا اصلی کام ہے۔ اگر علمائے اسلام نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ بنایا اور اسے انجام دینے کی کوشش نہ کی تو یورپ اور امریکہ کا جو حشر ہوگا سو ہوگا، خود دنیائے اسلام بھی تباہ ہو جائے گی کیونکہ وہی مسائل جو مغربی ممالک کو درپیش ہیں، تمام مسلم ممالک اور ہندستان میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکے ہیں اور ان کا کوئی صحیح حل بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم سب کے سب ان لوگوں کے الٹے سیدھے نسخے استعمال کرتے چلے جا رہے ہیں جو خود بیمار ہیں، اب یہ معاملہ صرف یورپ اور امریکہ کا نہیں بلکہ ہمارے اپنے گھر اور ہماری آئندہ نسلوں کا ہے۔

ان وجوہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور علما دونوں لارڈ لوتھین کے اس خطبے کو غور سے ملاحظہ کریں۔ بیچ میں حسبِ ضرورت ہم مطالب کی تشریح کرتے جائیں گے تاکہ مغزِ کلام تک پہنچنے میں مزید سہولت ہو۔

لارڈ لوتھین اپنے بحث کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

> ”ایک اور امر تنقیح طلب ہے جس کی طرف آج میں آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ کیا ہندستان دورِ جدید کی سائنٹفک اور عقلی تعلیم کے اس شدید نقصان سے بچ سکتا ہے جس میں یورپ اور امریکہ آج کل مبتلا ہیں؟
>
> مغرب میں حکمتِ جدیدہ سے دو بڑے نتیجے رونما ہوئے ہیں، ایک طرف تو اس نے فطرت اور اس کی طاقتوں پر انسان کی دسترس کو بہت زیادہ وسیع کردیا۔ دوسری طرف اس نے یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں میں اور عموماً ساری دنیا میں متوارث مذہب کے اقتدار کو کمزور کردیا۔ دنیائے جدید کی کم از کم آدھی خرابیاں انہی دو اسباب سے پیدا ہوئی ہیں، تہذیب یافتہ آدمی ان طاقتوں کے نشے سے چور ہوگیا ہے جو سائنس نے اس کو فراہم کردی ہیں۔ مگر اس نے علم اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق میں مساوی ترقی نہیں کی جو اس بات کی ضامن ہو سکتی تھی کہ یہ طاقتیں انسان کی تباہی کے بجائے اس کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں۔“

اس تمہید میں فاضل خطیب نے دراصل انسانی تہذیب وتمدن کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سائنس مجرد سائنس ہونے کی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ تحقیق، اجتہاد اور تلاش وتجسس کی ایک لگن ہے جس کی بدولت انسان کو عالمِ طبیعی کی چھپی ہوئی قوتوں کا حال معلوم ہوتا ہے اور وہ ان سے کام لینے کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ اس علم کی ترقی سے جو نئی طاقتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، ان کو جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے لگتا ہے تو یہ تمدن کی ترقی کہلاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں بجائے خود انسان کی فلاح کی ضامن نہیں ہیں۔ یہ جس طرح فلاح کی موجب ہوسکتی ہیں اسی طرح تباہی کی موجب بھی ہوسکتی ہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے اور ہوائی جہازوں پر دوڑنے لگا، ڈاک چوکیوں کے بجائے اگر تار برقی اور لاسلکی سے خبر رسانی ہونے لگی تو اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ انسان پہلے سے زیادہ خوش حال ہوگیا۔ ان چیزوں سے جس قدر اس کی خوش حالی بڑھ سکتی ہے اسی قدر اس کی مصیبت اور تباہی بھی بڑھ سکتی ہے۔ کیونکہ جس دورِ تمدن میں انسان کے پاس صرف تیر وشمشیر کے آلات تھے، اس کے مقابلہ میں وہ تمدن بدرجہا زیادہ مہلک ہوسکتا ہے جس میں اس کے پاس مشین گنیں اور زہریلی گیسیں، ہوائی جہاز اور تحت البحر کشتیاں ہوں۔ ترقیِ علم وتمدن کے موجب فلاح یا موجبِ ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اس تہذیب پر ہے جس کے زیرِ اثر علوم وفنون اور تمدن وحضارت کا ارتقا ہوتا ہے، ارتقا کا راستہ انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ طاقتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے، یہی انسان اور انسان کے باہمی تعلق کی نوعیت طے کرتی ہے۔ یہی اجتماعی زندگی کے اصول اور شخصی، قومی اور بین الاقوامی معاملات کے اخلاقی قوانین بناتی ہے اور فی الجملہ یہی چیز انسان کے ذہن کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے کہ علم کی ترقی سے جو طاقتیں اس کو حاصل ہوں انھیں اپنے تمدن میں کس صورت سے داخل کرے، کس مقصد کے لیے اور کس طرح ان کو استعمال کرے۔ مختلف استعمالات میں سے کن کو ترک اور کن کو اختیار کرے۔ عالمِ طبیعی (Physical World) کے مشاہدات اور قوانینِ طبیعی کی معلومات کے بجائے خود کسی اعلیٰ تہذیب کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان کی رو سے تو انسان کی حیثیت ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کی مدد سے صرف وہی نظریۂ حیات قائم کیا جاسکتا ہے جو مادیین کا نظریہ ہے، یعنی یہ کہ انسان کے لیے زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس

زندگی میں اپنی حیوانی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنا اس کا منتہائے مقصود ہے، اور کائنات میں جو تنازع للبقا اور انتخابِ طبیعی اور بقائے اصلح کا قانون جاری ہے، اس سے ہم آہنگ ہوجانا اور گردوپیش کی تمام مخلوقات کو کچل کر خود سب پر غالب ہوجانا ہی طاقت کا اصلی مصرف ہے۔ یورپ نے جو تہذیب اختیار کی وہ اسی نظریۂ حیات پر مبنی تھی۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تمدن کی ترقی نے انسان کو جس قدر طاقتیں بہم پہنچائیں وہ سب انسانیت کی فلاح کے بجائے اس کی تباہی کے راستہ میں صرف ہونے لگیں۔ اب خود یورپ والوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ اس حیوانی تہذیب سے بلند تر ایک انسانی تہذیب کی ضرورت ہے اور اس تہذیب کی اساس مذہب کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی۔

آگے چل کر لارڈ لوتھین فرماتے ہیں:

> ”سائنٹفک اسپرٹ (روحِ تحقیق) نے تو یہ ضرور کیا کہ رفتہ رفتہ پرانے توہمات کو دور کردیا۔ علم کے دائرے کو پھیلا دیا اور اس طرح مردوں اور عورتوں کو ان بہت سی قیود سے آزاد کردیا جن میں وہ پہلے جکڑے ہوئے تھے، مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ انسان کو روحانی اور مذہبی صداقت کا شدت کے ساتھ حاجت مند بنا کر چھوڑ دیا اور اس صداقت تک پہنچنے کا کوئی راستہ فراہم نہ کیا۔ اکثر اہلِ مغرب کا یہ حال ہے کہ وہ بچوں کی طرح تیز رفتاری اور عجوبہ رائی اور حواس کی لذتوں کے شوق میں منہمک ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت اُن سے سلب ہوگئی ہے اور عملاً ان کا کوئی ربط اس لامحدود وازلی وابدی حقیقت سے باقی نہیں رہا ہے، جسے مذہب پیش کرتا ہے۔
>
> مذہب جو انسان کا ناگزیر رہ نما، اور انسانی زندگی کو اخلاقی مقصد، شرف اور معنویت حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہے، اس کے اقتدار میں زوال آجانے کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا ان سیاسی مسلکوں کی گرویدہ ہوگئی ہے جو نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر قائم ہیں اور سائنس کی اس صورت پر ایمان لے آئی ہے جو محض مادّی ترقی کو منتہائے مقصود قرار دیتی اور زندگی کو روز بروز پیچیدہ اور گراں بار بنائے چلی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی اس کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کے لیے اپنی روح اور اپنی زندگی میں اس اتحاد کا پیدا کرنا دشوار ہو رہا ہے جو اس کو موجودہ دور کی سب سے بڑی مصیبت نیشنلزم سے نجات دلائے۔“

اس کے بعد لارڈ لوتھین نے ہندستان کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا ہے:

"کیا ہندستان کے دو بڑے مذہب، ہندوازم اور اسلام جدید دور کی تنقیدی اور تحقیقی روح کا مقابلہ مغرب کی مذہبی عصبیت کی بہ نسبت زیادہ کامیابی کے ساتھ کرسکیں گے؟ یہ اہم ترین سوال ہے اور اگر ہندستان کو ان مصائب سے بچانا ہے جو مغرب پر نازل ہوچکے ہیں تو اس ملک کے علمی اور مذہبی لیڈروں کو اسی سوال پر توجہ مرکوز کردینی چاہیے۔ اس میں تو شک نہیں کہ روحِ تحقیق رفتہ رفتہ توہم اور جاہلیت کے ان عناصر کو فنا کردے گی جو اب تک ہندستان کے عوام میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ بہت اچھا ہوگا، مگر کیا یہ چیز دونوں مذاہب کے اصولِ اخلاق اور روحانیت کو بھی ان لوگوں کے دل و دماغ سے نکال دے گی جو آگے چل کر ہندستان کی سیاسی، تمدنی اور صنعتی زندگی کے لیڈر بننے والے ہیں؟ میں ہندوازم اور اسلام کی اندرونی زندگی سے واقفیت کا مدعی نہیں ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے عناصر رکھتے ہیں جو اُن میں سے ہر ایک کو یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے مردوں اور عورتوں پر قابو رکھنے کے قابل بناسکیں گے۔ عیسائیت تو اپنی بعض ایسی غلط اعتقادی بندشوں کی وجہ سے اس میں ناکام ہوچکی ہے جنھوں نے اس مذہب کے جلیل القدر بانی کی پیش کردہ صداقتوں کو چھپالیا۔"

جیسا کہ لارڈ لوتھین نے خود اعتراف کیا ہے، حقیقتاً ان کو ہندوازم اور اسلام کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ انھوں نے محض دور سے دیکھ کر چند چیزیں ہندو مذہب میں اور چند اسلام میں ایسی پائی ہیں جو اُن کے نزدیک جدید تنقید و تحقیق کی روح کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کو اخلاق اور روحانیت کے بلندتر اصولوں پر قائم رکھنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ لیکن جو لوگ ان دونوں مذاہب، بلکہ ہندستان کے تمام مذاہب کا اندرونی علم رکھتے ہیں، ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روحِ تنقید و تحقیق کے مقابلہ میں اگر کوئی مذہب ٹھیر سکتا ہے، بلکہ صحیح تر الفاظ میں، اگر کوئی مذہب اس روح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو لے کر آگے بڑھ سکتا ہے اور ترقی و روشنی کے دور میں پوری نوعِ انسانی کا مذہب بن سکتا ہے تو وہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مسیحیت کیوں ناکام ہوئی؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ کوئی اجتماعی (Socia!) مسلک نہیں ہے بلکہ

اجتماعیت کی عین نفی ہے۔ اس کو صرف فرد کی نجات سے بحث ہے اور اس کی نجات کا راستہ بھی اس نے تجویز کیا ہے کہ دنیا سے منہ موڑ کر اپنا رُخ آسمانی بادشاہت کی طرف پھیر لے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی قوموں نے ترقی کے راستہ پر قدم بڑھایا تو مسیحیت ان کی مددگار ہونے کے بجائے مزاحم ہوئی اور انھیں اس کی بندشیں توڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اسی سے ملتا جلتا حال ہندوازم کا بھی ہے۔ اُس کے پاس بھی کوئی ترقی پرور فلسفہ اور کوئی عقلی قانونِ اخلاق، اور کوئی وسعت پذیر نظامِ اجتماعی نہیں ہے۔ سب سے بڑی طاقت جس نے اب تک ہندوؤں کو ایک سوشل سسٹم میں باندھے رکھا ہے اور دوسری تہذیبوں کا اثر قبول کرنے سے روکا ہے، وہ ان کا ورن آشرم (Caste System) ہے۔ مگر موجودہ دور کی روحِ تنقید و تحقیق کے سامنے اس بندھن کا ٹوٹنا یقینی ہے اور یہ ٹوٹ کر رہے گی۔ اس کے بعد کوئی چیز ہندو سوسائٹی کو ٹوٹنے سے نہ بچاسکے گی اور اس کے مقفل دروازے بیرونی اثرات کے لیے چوپٹ کھل جائیں گے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہندوؤں کے قدیم قوانین معاشرت و تمدن اور ان کے پرانے بت پرستانہ توہمات اور ان کے غیرعقلی اور علمی فلسفیانہ قیاسات، دورِ جدید کی علمی ترقی اور اجتماعی بیداری کے سامنے نہیں ٹھیر سکتے۔ اب ہندو روز بروز ایک ایسے دوراہے کے قریب پہنچتے جارہے ہیں جہاں ان کی اور بڑی حد تک تمام ہندستان کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، یا تو وہ اسلام کے خلاف اسی تعصب میں گرفتار رہیں گے جس میں یورپ کی نشاۃِ جدیدہ (Renaisance) کے موقع پر مسیحی اہلِ یورپ گرفتار تھے اور اسی طرح اسلام سے منحرف ہوکر مادّہ پرستانہ تہذیب کا راستہ اختیار کریں گے، جس طرح اہلِ یورپ نے اختیار کیا۔ یا پھر فوج در فوج اسلام میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔

اس فیصلہ کا انحصار بڑی حد تک مسلمانوں اور خصوصاً ان کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے طرزِ عمل پر ہے۔ اسلام اپنے نام سے تو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ اس کے اصول اگر محض کتاب میں لکھے ہیں تو اُن سے بھی کسی معجزے کا صدور ممکن نہیں۔ جس انتشار اور بے عملی کی حالت میں مسلمان اس وقت مبتلا ہیں، جو جمود ان کے علما پر طاری ہے اور جس زمانہ انفعال و تأثر کا اظہار ان کی نئی تعلیم یافتہ نسلوں سے ہورہا ہے، اس سے ہندستان کی روح کو فتح کرنا تو درکنار، یہ بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اسلام کے نام لیوا خود اپنی جگہ ہی پر قائم رہ جائیں گے۔ انقلاب کے تیز رو سیلاب میں کسی جماعت کا ساکن کھڑا رہنا غیر ممکن ہے۔ یا اس کو رو میں بہنا پڑے گا یا پوری

مردانگی کے ساتھ اٹھ کر سیلاب کا منہ پھیر دیا ہوگا۔ یہ دوسری صورت صرف اسی طرح رونما ہو سکتی ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست کی جائے اور ان میں اسلامی زندگی کی روح پھونک دی جائے۔ دوسرے علمائے اسلام اور نئے تعلیم یافتہ مسلمان مل کر اصول اسلام کے مطابق زندگی کے جدید مسائل کو سمجھیں اور علمی و عملی دونوں صورتوں میں اُن کو اس طرح حل کرکے بتائیں کہ اندھے متعصبین کے سوا ہر معقول انسان کو تسلیم کرنا پڑ جائے کہ ایک ترقی پذیر تمدن کے لیے اسلامی تہذیب کے سوا اور کوئی اساس صحیح اور بے عیب نہیں ہوسکتی۔

ہندستان میں مذہب اور سائنس کی نزاع کا وہ تصور اب تک چلا جا رہا ہے جو یورپ میں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تھا لیکن یورپ میں نقشہ بدل چکا ہے اور یورپ کا پس خوردہ کھانے والے ہندستان میں بھی عنقریب نقشہ بدل جانے والا ہے۔ لہٰذا وہ وقت قریب آرہا ہے جب مذہب کے خلاف کم از کم علمی و عقلی حیثیت سے یہ تعصب باقی نہ رہے گا۔ بشرطیکہ ہم اس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔ اس حقیقت کی طرف لارڈ لوتھین نے مختصر الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ”ساٹھ برس پہلے سائنس اور مذہب میں ایسا معرکہ جاری تھا جس کے ختم ہونے کی توقع نہ تھی۔ زندگی کے روحانی تصور اور مشینی تصور کے درمیان ایسی جنگ برپا تھی جس کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت سے پہلے ختم نہ ہوگی۔ مگر آج دونوں فریقوں نے ڈگیں ڈال دی ہیں۔ نہ سائنس داں، اور نہ دین دار دونوں میں سے کوئی بھی آج اس تحکم کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس نے کائنات کا معمہ حل کرلیا ہے، بلکہ درحقیقت دل میں دونوں کے یہ شبہ پیدا ہو چکا ہے کہ آیا وہ اس معمہ کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ لہٰذا اب ایک ایسے امتزاج کا امکان ہو چکا ہے جو تحقیقِ علمی کے نئے نئے زورشور میں غیر ممکن نظر آتا تھا۔“

لارڈ لوتھین بہرحال مذہب کے مسیحی تصور سے آزاد نہیں ہیں اور مذہب کا وہ عقلی تصور ان تک پہنچا ہی نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہی سوچ سکتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اب کوئی امتزاج ہوسکتا ہے لیکن ہم مذہب و سائنس کے امتزاج کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو حقیقی مذہب وہ ہے جو سائنس کی روح اور اس کی

راہنما طاقت بن جائے۔ اسلام درحقیقت ایسا ہی مذہب ہے اور آج اس کو سائنس کی روح بننے سے اگر کوئی چیز روکے ہوئے ہے تو وہ اس کا اپنا اندرونی نقص نہیں ہے بلکہ اس کے علم برداروں کی غفلت اور موجودہ سائنس کے علم برداروں کا جہل اور جاہلانہ تعصب ہے۔ یہ دو اسباب دور ہوجائیں، پھر یہ سائنس کے قالب میں جان ہی بن کر رہے گا۔

آگے چل کر فاضل خطیب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ موجودہ دور کی علمی بیداری اور عقلی تنقید کے سامنے کس قسم کا مذہب ٹھیر سکتا ہے؟ انسان اس روشنی کے عہد میں جس مذہب کا طلب گار ہے اس کی خصوصیات کیا ہونی چاہییں؟ اور اس وقت انسان کی اصلی حاجات کیا ہیں جن کے لیے وہ مذہب کی رہنمائی ڈھونڈھ رہا ہے؟ یہ اس خطبہ کا سب سے زیادہ قابل توجہ حصہ ہے:

> ”اگر میں صورتِ حال کا غلط اندازہ نہیں کر رہا ہوں تو یہ حقیقت ہے کہ جو امتحان اس وقت مذہب کو درپیش ہے اس سے وہ صرف اسی صورت میں کامیابی کے ساتھ گزر سکتا ہے جب کہ نوخیز نسل اس کے اندرونی نظام کی جانچ پڑتال کرکے اس امر کا پورا اطمینان کرلے کہ زندگی میں جن عملی مسائل اور جن پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے ان کا بہترین حل اس مذہب میں موجود ہے۔ شخصی مذہب کا دور اب گزر چکا ہے۔ محض جذباتی مذہب کی بھی اب کسی کو حاجت نہیں۔ اس قسم کے مذہب کا زمانہ بھی اب نہیں رہا جو فرد کو صرف اس حد تک تسلی اور سہارا دے سکتا ہو کہ اس کے اخلاقی طرزِ عمل کے لیے کچھ ہدایات دے دے اور ایک ایسی نجات کی امید دلا دے جس کا حال مرنے کے بعد ہی کھل سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا سائنٹفک آدمی تو ہر چیز کو حتیٰ کہ خود صداقت کو بھی بین نتائج کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو مذہب کا اتباع کرنا ہے تو وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب اس کو یہ بتائے کہ وہ اس کی زندگی کے عملی مسائل کا اپنے پاس کیا حل رکھتا ہے۔ بہت سے جنموں کے بعد آخرکار نروان حاصل ہونے کی امید، یا موت کے دروازے سے گزر جانے کے بعد آسمانی بادشاہت میں پہنچ جانے کی توقع ایسی چیز نہیں ہے کہ صرف اسی کی بنیاد پر وہ مذہب کو قبول کرلے۔ اس کی فلسفیانہ جستجو کے لیے مذہب کو سب سے پہلے تو وہ کلید فراہم کرنا چاہیے جس سے وہ کائنات کے معمے کا کوئی قابلِ اطمینان حل پاسکے۔ پھر اُسے ٹھیک

ٹھیک سائنٹفک طریقہ پر علت اور معلول، سبب اور نتیجہ کا بین تعلق ثابت کرتے ہوئے یہ دکھانا چاہیے کہ انسان ان طاقتوں کو کس طرح قابو میں لائے جو اس وقت بے قابو ہو کر نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے تباہ کر دینے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔ اور کس طرح وہ بے روزگاری، غیر معقول عدم مساوات، ظلم و ستم، معاشی لوٹ، جنگ، اور دوسری اجتماعی خرابیوں کا انسداد کرے اور افراد کی باہمی کشمکش اور خاندانی نظام کی برہمی کو کس طرح روکے جس نے انسان کی مسرتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔

انسان آج صرف اس وجہ سے مذہب کی طرف دیکھ رہا ہے کہ سائنس نے اس کی مشکلات کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس لیے وہ مذہب سے اپنے شکوک اور اپنی مشکلات کا حل طلب کرنے میں اتنا بے چین ہے جتنا اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ اب اگر مذہب اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے کھوئے ہوئے میدان کی بازیافت چاہتا ہے تو اسے ان سوالات کا روحانی سائنٹفک جواب دینا چاہیے جس کی صحت کو نتائج کے معیار پر اسی دنیا میں جانچا اور پرکھا جا سکے۔ موت کے بعد دوسری دنیا پر نہ اٹھا رکھا جائے۔ ہم اہلِ مغرب جانتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا سوال ہے جو ہمارے اس دور میں سامنے آیا ہے کیا آپ ہندستان میں اس کا جواب دے سکتے ہیں؟"

لارڈ لوتھین کی تقریر کا یہ حصہ پڑھتے وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پیاسا ہے جسے پانی کا علم تو نہیں مگر وہ اپنی پیاس کی کیفیات کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر رہا ہے اور بتاتا جاتا ہے کہ میرے جگر کی آگ کوئی ایسی چیز مانگتی ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں، اگر پانی اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو اس کی فطرت فوراً پکار اٹھے گی کہ جس چیز کا وہ پیاسا ہے وہ یہی چیز ہے اور لپک کر اسے منہ سے لگا لے گا۔ یہ حال صرف لارڈ لوتھین ہی کا نہیں ہے بلکہ یورپ اور امریکہ اور تمام دنیا میں جو لوگ موجودہ تہذیب و تمدن کی گرمی سے خوب تپ چکے ہیں اور فلسفہ و سائنس کے صحرا میں کنارے کی شادابیوں سے گزر کر وسط کی بے آب و گیاہ پہنائیوں تک پہنچ چکے ہیں، ان سب کو آج یہی پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ سب انھی صفات کی ایک چیز مانگ رہے ہیں جن کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے اور ان سب کا یہی حال ہے کہ پانی کا نام نہیں جانتے، یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں پایا جاتا ہے مگر رو رو کر پکارتے ہیں کہ

جگر کی بجھے آگ جس سے وہ شے لا

پانی کا نام انھوں نے سنا تو ضرور ہے مگر اس نام سے یہ محض اس لیے گھبراتے ہیں کہ اصل شے کو انھوں نے خود دیکھا نہیں ہے اور اپنے جاہل و متعصب اسلاف سے سنتے یہی چلے آرہے ہیں کہ خبردار پانی کے پاس نہ پھٹکنا، یہ ایک بڑی زہریلی چیز کا نام ہے لیکن اب یہ اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نام چھپا کر نفسِ شے کو ان کے سامنے رکھ دیا جائے تو بے اختیار کہہ دیں گے کہ ہاں ٹھیک یہی وہ چیز ہے جس کے ہم پیاسے ہیں۔ اس کے بعد جب انھیں بتایا جائے گا کہ حضرت! یہ وہی "پانی" ہے جس کے نام سے آپ گھبراتے تھے تو حیرت سے ان کا منہ کھلا رہ جائے گا اور کہیں گے کہ کیسا دھوکا تھا، جس میں ہم مبتلا تھے۔

موجودہ زمانے کا "سائنٹفک آدمی" عیسائیت کو خوب جانچ اور پرکھ چکا ہے اور یہ بات اس پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ وہ اس کے مرض کی دوا نہیں ہے۔ ہندوازم اور بدھ ازم کے خیالی فلسفوں اور ان کی تاریخی قدامت پرستی کو دیکھ کر وہ کبھی کبھی اُن سے مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر سائنٹفک تنقید و تحلیل کے پہلے ہی امتحان میں ان کی ناکامی کھل کر رہتی ہے۔ بدھ مت تو قریب قریب عیسائیت کا ہندو ایڈیشن ہے۔ رہا ہندوازم تو وہ خود ان مشکلات اور پیچیدگیوں کو پیدا کرتا ہے جن سے نکلنے ہی کے لیے موجودہ زمانے کا سائنٹفک آدمی مذہب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ انسان اور انسان میں غیر معقول نامساوات سب سے زیادہ اسی کے دائرے میں پائی جاتی ہے، معاشی لوٹ کی سب سے بدتر صورت، یعنی مہاجنی و سود خواری اس کے سسٹم کا ایک غیر منفک جز بن چکی ہے۔ جنگ کی اصلی وجہ یعنی انسان کی نسلی تقسیم اور نسلی منافرت اس کی عین اساس میں پیوست ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے جو نظام اس نے قائم کیا ہے وہ انسانوں کو ملانے والا نہیں بلکہ بے شمار طبقوں اور گوتروں میں تقسیم کرنے والا ہے۔ اس کے قوانینِ معاشرت اتنے بوسیدہ ہیں کہ موجودہ علمی و عملی بیداری کے دور میں خود ہزاروں برس کے خاندانی ہندو ان قوانین کو توڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد علم اور عقل پر نہیں بلکہ تعصبات اور توہمات پر ہے۔ ان دنیوی مسائل سے اوپر، اخلاقیات اور الٰہیات کے دائرے میں وہ اس سے بھی زیادہ ناقص پایا جاتا ہے۔ کائنات کے معمے کو اطمینان بخش طریقے پر حل کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی کلید نہیں۔ اس کے عقائد اذعانی عقائد ہیں، عملی یا عقلی ثبوت ان میں سے کسی چیز کا نہیں دیا جا سکتا۔

اخلاقیات میں وہ دل خوش کن مفروضات کا ایک طلسم ضرور بناتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ایک طلسم مہاتما گاندھی نے بنا رکھا ہے مگر معقولات اور حکمت عملی (Practical Wisdom) سے اس کا دامن خالی ہے۔ موجودہ علمی بیداری کے دور میں اس کی ناکامی اگر کھلی نہیں تو عنقریب کھل جائے گی۔

اس کے بعد میدان میں صرف اسلام رہ جاتا ہے اور وہی ان معیاروں میں سے ایک ایک معیار پر پورا اترتا ہے جو آج کل "سائنٹفک آدمی" اپنے مذہبِ مطلوب کے لیے پیش کر رہا ہے یا کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ مذہب محض ایک شخصی معاملہ ہے اور محض انفرادی ضمیر ہی سے اس کا تعلق ہے۔ اب ایک فرسودہ بات ہو چکی ہے۔ یہ انیسویں صدی کی بہت سی خام خیالیوں میں سے ایک تھی، جسے بیسویں صدی کی اس چوتھی دہائی میں بھی ہندستان کے بعض وہ قدامت پسند اب تک رٹے جا رہے ہیں جو ادعائے تجدد کے باوجود ہمیشہ دنیا سے پچاس برس پیچھے چلنے کے خوگر ہیں۔ اب قریب قریب یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ فرد کا تصور جماعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص دوسرے کے ساتھ بے شمار چھوٹے بڑے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے۔ اور سوسائٹی من حیث المجموع ایک جسم کا حکم رکھتی ہے۔ جس میں افراد کی حیثیت زندہ جسم کے اعضاء کی سی ہے۔ مذہب کی ضرورت اگر ہے تو وہ صرف فرد کو اپنے ضمیر کے اطمینان اور اپنی نجات بعد الموت ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کو اپنی تنظیم اور اپنی دنیوی زندگی کے سارے کاروبار چلانے کے لیے ہے اور اگر اس چیز کی ضرورت نہیں ہے تو فرد کو بھی اور جماعت کو بھی نہیں۔ یہ تصور سراسر ایک طفلانہ تصور ہے کہ اجتماعی زندگی کا نظام کچھ اور ہو اور اس نظام سے بے تعلق ہو کر افراد کے مذہبی عقائد اور ان کے مذہبی اعمال کچھ اور ہوں۔ مذہبی عقائد اور مذہبی اعمال کا کوئی ربط اگر اجتماعی زندگی سے نہ ہو تو ایسے عقائد اور اعمال محض بے کار ہیں اور صرف بے کار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے اجتماعی نظام میں ان کا مضمحل ہو جانا یقینی ہے، جس کے دوسرے اجزا کے ساتھ وہ تعامل (Interaction) قبول نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا دو صورتوں میں سے لامحالہ کوئی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ یا تو پوری جماعت کا نظام سراسر لامذہبی ہو۔ اور مذہب کو قطعی طور پر انسان کی زندگی سے خارج کر دیا جائے جیسا کہ اشتراکیوں کا مسلک ہے، یا پھر اجتماعی نظام پورا کا پورا مذہبی ہو اور علم و

تمدن دونوں کے لیے مذہب کو رہنما تسلیم کیا جائے جیسا کہ اسلام کا مقتضا ہے۔ پہلی صورت کا تجربہ دنیا بہت طویل مدت تک کر چکی ہے، اس سے وہی کڑوے پھل پیدا ہو سکتے تھے، وہی پیدا ہوئے اور وہی آئندہ بھی پیدا ہوں گے جن کا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے۔ اب دنیا کی نجات صرف دوسری صورت میں ہے اور اس کے بروئے کار آنے کے مواقع روز بروز پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

مگر جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ان مواقع سے فائدہ اٹھانا یا ان کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ واقعات کی رفتار دنیا کو، اور دنیا کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے ہندستان کو بھی ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں سے وہ اسلام کی طرف بھی مڑ سکتی ہے اور مادہ پرستی اور فسادِ اخلاق کے اسفل السافلین کی طرف بھی طبعاً اس کا رُخ ابھی تک دوسرے راستے کی طرف ہے، کیونکہ اس راستے پر وہ ایک مدتِ دراز تک بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ اس راستے کے مہالک دیکھ دیکھ کر وہ سہم رہی ہے اور چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتی ہے کہ کوئی بچاؤ کی راہ بھی ہے یا نہیں، مگر بچاؤ کی راہ خود اس کی اپنی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ وہ درحقیقت اس وقت ایسے لیڈروں کی محتاج ہے جو وقت کے ساتھ اٹھ کر ان کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھا دیں اور اسلام کی صراطِ مستقیم کا واحد راہِ نجات ہونا ثابت و مبرہن کر دیں۔ ایک ایسی مجاہد و مجتہد جماعت اگر مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو مسلمان تمام دنیا کے پیشوا بن سکتے ہیں۔ ان کو وہی مقامِ عزت پھر حاصل ہو سکتا ہے جس پر وہ کبھی سرفراز تھے اور جس پر مغربی قوموں کو متمکن دیکھ کر آج اُن کے منہ میں پانی بھرا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اگر اس قوم کے جمہور اسی طرح دون ہمتی و پست حوصلگی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اگر اس کے نوجوان یونہی غیروں کا پس خوردہ کھانے کو اپنا منتہائے کمال سمجھتے رہے، اگر اس کے علما اپنی انہی پرانی فقہ و کلام کی فرسودہ بحثوں میں الجھے رہے، اگر ان کے لیڈروں اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت کا یہی حال رہا کہ لشکرِ اغیار کے پیچھے لگ چلنے کو مجاہدانہ عزیمت کا بلند ترین مرتبہ سمجھیں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمالِ دانش مندی خیال کریں۔ غرض اگر اس قوم کے دست و پا سے لے کر دل و دماغ تک سب کے سب تعطل یا خام کاری ہی میں گرفتار رہیں اور اس کروڑوں کے انبوہ سے چند مردانِ خدا بھی جہاد اور اجتہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر باندھ کر نہ اُٹھ سکیں۔ تو پھر دنیا جس اسفل السافلین کی

طرف جا رہی ہے اسی طرح جہنم میں یہ قوم بھی دنیا کی امامت کے ساتھ بدترین جا گرے گی اور خطیب خود اس کی ایک مثال بن کر رہ جائے گا۔

بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (ھود:۴۴)

"دور ہوئی ظالموں کی قوم!"

(ترجمان القرآن، رجب ۱۳۵۴ھ، اکتوبر ۱۹۳۵ء)

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

خطباتِ خالدہ ادیب خانم

ترکی کی مشہور فاضل و مجاہد خاتون، خالدہ ادیب خانم اب سے کچھ مدت قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائی تھیں۔ وہاں انہوں نے دہلی میں چند خطبات ارشاد فرمائے تھے جن کا اردو ترجمہ جامعہ کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" کے نام سے کیا ہے۔ اس صحبت میں ہم ان مجموعہ خطبات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں گے۔

دنیائے اسلام میں اس وقت دو ملک ایسے ہیں جن کو دو مختلف حیثیتوں سے مسلمانوں کی پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ذہنی حیثیت سے مصر اور سیاسی حیثیت سے ترکی۔ مصر کے ساتھ تمام عالم اسلامی کے تعلقات زیادہ گہرے ہیں، کیونکہ اس کی زبان عربی ہے جو تمام دنیائے اسلام کی مذہبی زبان ہے۔ اس کا لٹریچر تمام دنیا کے مسلمانوں میں پھیلتا ہے۔ اس کے ذہنی اثرات مغرب سے مشرق تک پہنچتے ہیں اور وہی مسلمانوں کے درمیان ربط و اتصال قائم رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بخلاف اس کے ترکی قوم کی مجاہدانہ زندگی اور مغربی طاقتوں کے مقابلہ میں اس کی شاندار مدافعت اور ماضی میں اس کی قیادت و عظمت کے نقوش نے تمام عالم اسلامی پر چھا جانے کا وہ اثر پیدا کیا ہے کہ تمام مسلمانوں میں سرداری اور پیشوائی کا منصب حاصل ہے۔ لیکن زبان کی اجنبیت اور ربط و تعلق کے فقدان نے ترکی اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل کر دیا ہے جس کے سبب سے ترکی قوم کے ذہنی ارتقاء اور اس کی اندرونی حالت

کے دس بارہ برسوں میں جو انقلاب ترکی میں رونما ہوئے ان کے باطنی اسباب اور ان کی اصل روح کو جاننے اور سمجھنے کا موقع تو ہم کو بہت ہی کم ملا ہے۔ بہت سے لوگ ترکوں سے سخت ناراض ہیں، بعض ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں، بعض ان کی مغربیت کو اپنی مغربیت پرستی کے لیے برہان قاطع بنائے بیٹھے ہیں، اور جو تھوڑی بہت معلومات ہیں بھی تو وہ ترکی کی روح کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

اس حالت میں ہم اس کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ خود ترکی جدید کے معماروں میں سے ایک ایسی ہستی نے ہندوستان میں آ کر ہمارے سامنے اپنی قوم کے باطن کو ظاہر کیا ہے جو انقلاب کی اسٹیج پر محض ایکٹرس ہی نہ تھی اس انقلاب کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت تھی۔ اس کے ساتھ وہ خدا کے فضل سے عالمانہ نظر، اور فلسفیانہ فہم، اور مفکرانہ تعمق بھی رکھتی ہے، جس کی بدولت وہ خارجی واقعات کے اندرونی محرکات کو سمجھ بھی سکتی ہے اور سمجھا بھی سکتی ہے۔ ایسے مستند و معتبر ذریعہ سے ہمیں اب پہلی مرتبہ ترکی کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس نے ترکی جدید کی روح کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور پوری صداقت و دیانت کے ساتھ ہمیں بتایا ہے کہ جو قوم آج دنیائے اسلام کی نہ صرف رہنمائی کر رہی ہے بلکہ ذہنی رہنمائی کے لیے بھی کوشاں ہے، در حقیقت وہ خود اپنے باطن میں کیا ہے، کن عناصر سے اس کی تعمیر ہوئی ہے، کون سی قوتیں اس میں کام کر رہی ہیں، کون سے اسباب اس کو موجودہ مقام تک کھینچ کر لائے ہیں اور اب کس رخ پر وہ جا رہی ہے۔ یہ مستند ذخیرۂ معلومات مختلف حیثیتوں سے ہمارے لیے مفید ہے۔ اس کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ ترکی قوم کا حقیقی حال ہم پر روشن ہو گیا بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ترکی کی جو رہنمائی اب ہماری جدید نسلوں تک پہنچ رہی ہے اس کی روح کو ہم زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ اور دنیائے اسلام میں جو انقلاب اس وقت رونما ہو رہا ہے اس کے اندرونی اسباب کو سمجھنے کا ایک اور موقع ہم کو مل گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم خالدہ ادیب خانم کے ذریعہ سے ترکی جدید کو سمجھیں، ہمیں خود ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کا دل پورا پورا مسلمان ہے، ایمان سے لبریز ہے اور ایمان بھی ایسا جس پر ہم کو رشک کرنا چاہیے، کیونکہ وہ ایک مجاہد عورت کا

ایمان[1] ہے۔ الحاد اور بے دینی کا شائبہ تک ان کے خیالات میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام سے ان کو محبت ہے، ویسی ہی محبت جیسے ایک سچی مسلمان عورت کو ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا دل جیسا مسلمان ہے ان کا دماغ ویسا نہیں ہے۔ انھوں نے تمام تر مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے۔ مغربی علوم ہی کا مطالعہ کیا ہے، مغربی عینک ہی سے دنیا اور اسلام اور خود اپنی قوم کو دیکھا ہے اور ان کی تمام فکری و نظری قوتیں مغربی سانچے ہی میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے دل میں چھپی ہوئی اسلامیت اور مشرقیت نے مغربیت کے اس دماغی استیلا کی بہت کچھ مزاحمت کی ہے اور اسی مزاحمت کا نتیجہ ہے کہ ترکی قوم کے دوسرے انقلابی لیڈروں کی بہ نسبت ان کے خیالات میں بہت کچھ اعتدال پایا جاتا ہے لیکن یہ مزاحمت ان کو مغربیت کے غلبہ سے نہیں بچا سکی ہے۔

اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہت کچھ محدود معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن اور سنت نبوی اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں انھوں نے شاید اس وقت کا دسواں حصہ بھی صرف نہیں کیا ہے جو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور عمرانیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی جو جھلک ہم کو ان کے خطبات میں نظر آتی ہے اس میں حسن عقیدت تو ضرور موجود ہے، مگر فہم اور تدبر اور بصیرت بہت کم ہے۔

اپنے آخری خطبہ میں وہ فرماتی ہیں کہ گاندھی جی کی ذات "جدید اسلام کا ایک عمل نمونہ ہے۔" یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو نہیں جانتا کہ اسلام کیا ہے، جدید اور قدیم کی نسبتوں سے کس قدر بالا و برتر ہے اور اس کا کامل نمونہ کیسا ہوتا ہے۔ اسلامی سیرت کی خصوصیات پر جس شخص کی نظر ہو، اور جس نے اس سیرت کے کامل نمونوں کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو، اس کی نگاہ میں گاندھی جی کی تو حقیقت کیا ہے، تاریخ عالم کے بڑے بڑے ہیرو بھی نہیں جچتے اور یہ کچھ قومی عصبیت کی بنا پر نہیں، نا قابل انکار تاریخی حقائق کی بنا پر ہے۔ ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسین بن علیؓ، احمد بن حنبلؒ اور عبد القادر جیلانیؒ کی سیرتیں سامنے رکھیے اور پھر انصاف سے دیکھیے کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر تاریخ عالم کی کون شخصیت اس قابل ہے کہ ان سیرتوں کے مقابلہ میں لا کر رکھی جا سکے؟

عثمانی قوم کے سیاسی مزاج کی ترکیب میں ان کو ترکی قوم کی قدیم نسلی خصوصیات سے

---

(۱) افسوس ہے کہ بعد کے مطالعے نے مجھ کو اس رائے پر بھی قائم نہ رہنے دیا۔ (۱۹۳۴ء)

ترکی قوم(1) اسلام میں اس وقت داخل ہوئی جب مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا۔ روحِ جہاد اگرچہ زندہ تھی مگر روحِ اجتہاد مردہ ہو چکی تھی۔ اسلام میں بصیرت رکھنے والے مفکرین اور تفقہ سے بہرۂ وافر رکھنے والے فقہا ناپید تھے۔ تہذیبِ اسلامی نیم جاں اور فکرِ اسلامی قریب قریب بے جان ہو چکی تھی۔ شریعت میں تقلیدِ جامد کا غلبہ تھا۔ تمدن میں عجمیت اور رومیت کے عناصر پیوست ہو چکے تھے۔ تصوف پر اشراقیت کا اور تفکر پر فلسفہ کا اثر غالب آ گیا تھا۔ قرآن اور سنت سے براہِ راست اکتسابِ علم کرنے والے مفقود تھے۔ علما زیادہ تر الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے، کلام کی پیچیدگیوں میں الجھنے اور متقدمین کے روندے ہوئے رستوں پر شرح و ایضاح کے جھگڑے چلانے والے تھے۔ امرا اکثر و بیشتر قیصر و کسریٰ کے رنگ پر چلنے والے تھے۔ صوفیوں اور روحانی پیشواؤں اسلام کے دورِ اول کی حقیقی صوفیت سے بیگانہ اور راہبوں اور جوگیوں کی پیروی کرنے والے تھے۔ علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی رک گئی تھی۔ تحقیق و اکتشاف کی راہ میں ان کے قدم قریب قریب ختم ہو گئے تھے اور عروج کے بعد زوال کے آثار تمام ممالکِ اسلامیہ میں پیدا ہو چکے تھے۔

اس طرح اسلامی تاریخ میں ترکوں کی ابتدا ہی ایک بنیادی کمزوری کے ساتھ ہوئی۔ دولتِ عثمانیہ کا قیام تقریباً اسی زمانہ میں ہوا ہے جب یورپ میں ذہنی ارتقا اور علمی نہضت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اگرچہ عثمانیوں نے ابتدائی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ کو عظیم شکستیں دے کر اسلام کی دھاک بٹھا دی تھی لیکن اس زمانہ میں عام مسلمان قوموں کے ساتھ ساتھ ترک بھی رفتہ رفتہ تنزل کی طرف جا رہے تھے اور ان کا مقابلہ جن مغربی قوموں سے تھا وہ تیز رفتاری کے ساتھ مادی اور ذہنی ترقی کی راہ پر گامزن تھیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں حالات نے پلٹا کھایا۔ فرنگیوں کی عسکری تنظیم اور مادی و معنوی قوت اس حد تک بڑھ گئی کہ انھوں نے [illegible] کے معرکہ میں پہلی مرتبہ [illegible] پر ترکوں کو نمایاں شکست دی۔ مگر ترکوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ اسی پستی میں گرتے رہے اور فرنگی برابر ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں ترکوں کی اخلاقی، مذہبی، سیاسی، علمی اور تمدنی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ گئی اور فرنگیوں کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو گیا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظامِ سلطنت

ہے کہ وہاں [illegible] حتیٰ کہ افلاطون کی جمہوریت تک، سب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مگر نہیں نظر آتے تو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اثرات۔ حالانکہ یہی چیز ہے جس نے وسط ایشیا کے بدوی ترکوں کو تہذیب و تمدن سے آراستہ کیا اور ان کے اندر جہاں گیری کے ساتھ جہانبانی کی استعداد پیدا کی اور ان کو نوعِ انسانی کی ایک تخریبی قوت کے بجائے ایک تعمیری طاقت بنا دیا۔ حالاتِ حاضرہ سے زیادہ اسلام کا جو اثر "عثمانیت" میں دیکھا جا سکتا ہے وہ محض اسلامی عدل و مساوات ہے۔ مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ جب سلطان سلیم اپنی شمشیرِ اسلام کو پھیلا رہا ہے اور شیخ الاسلام جمالی آفندی اس کو اس فعل سے باز رکھنے کھڑا ہوتا ہے اور سلیم جیسا جبار فرمانروا اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیتا ہے، تو اس عظیم الشان واقعہ میں حالاتِ حاضرہ کو اسلامی عدل کے بجائے عثمانی قومیت کا احساس اور عثمانی اصولِ سلطنت کی حکومت کا عنصر ہی نظر آتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ جمالی آفندی کے فتوے میں جو کچھ اثر بھی تھا وہ کی روح تھی اور وہ اسلامی حق پرستی کی طاقت تھی جس نے سلیم کے سامنے اس کو فتویٰ دینے کی جرأت دلائی اور وہ اسلامی صفت تھی جس نے سلیم کو اس شرعی فتویٰ کے آگے سر جھکا لینے پر مجبور کر دیا۔

حالاتِ حاضرہ ترکی کے موجودہ حکمراں طبقہ کی انتہا پسندی، استبدادیت اور معاشرتی تبدیلی کی تنظیم سے برپا ہوئی مغربیت [illegible] رجحانات اور مذہب کے متعلق ان کی روش سے پورا معلوم ہوتا ہے وہ مغربیت اور شرقیت کا معتدل امتزاج چاہتی ہیں۔ "مادیت" کو "روحانیت" میں مداخلت کی خواہش مند ہیں، اور اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتی ہیں کہ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں میں جو امتزاج اسلام نے پیدا کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔ مگر خود اسلام میں پوری بصیرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کو معلوم نہیں کہ اصولِ اسلام کے تحت امتزاج کی صحیح صورت کیا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان توسط اور اعتدال کا خطِ مستقیم کہاں واقع ہے۔ ہم اگر ان کی [illegible] سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ان کے خطبات میں ہم کو ترکی جدید کی ذہنیت اور اس کے رجحانات اور انقلاب کے تاریخی اسباب کا ایک صاف اور صحیح بیان مل جاتا ہے۔ اور وہی ہم کو مطلوب ہے۔

(1) یہاں ترک قوم سے مراد عثمانی ترک ہیں۔

کی اصلاح، علومِ جدیدہ کی اشاعت، طرزِ جدیدہ پر عسکری تنظیم، اور جدید مغربی آلاتِ حرب کی ترویج شروع کی، لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علما نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے۔ مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی، یوروپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا، جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانعِ ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے مقابلہ میں بالکل سینہ بہ سینہ کھڑے تھے اور برسرِ پیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے، اور خود اُن کے ماتحت یوروپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے۔ ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کی۔ اور علما و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہوسکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے، مگر علما اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں۔ ان سے اسلام کو خراب کیا جارہا ہے، سلطان بے دین ہوگیا ہے اور طرزِ جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لیے خرابیِ ایمان کا موجب ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کے اہلِ دماغ لوگوں میں اپنی قومی پستی کا عام احساس پیدا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے مغربی قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا اور ان کے علوم و آداب کا مطالعہ کیا۔ ان کی تنظیمات پر گہری نگاہ ڈالی اور اپنی سلطنت کے قوانین، انتظامی امور، تعلیمی ادارات اور حربی نظام میں ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جن سے وہ مغربی قوموں کے

دوش بدوش ترقی کرسکیں۔ خالدہ خانم کے بقول یہ وہ لوگ تھے جن کی رگ و پے میں اسلامیت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے دل اور دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا مگر مغرب کے مقابلہ میں کمتری کا احساس ہرگز نہیں تھا۔ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے بلا امتیاز اس کی ہر چیز کو قبول کرنے والے نہ تھے۔ اُن کا مقصد صرف یہ تھا مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی سلطنت اور اپنی قوم کی کمزوریوں کو دور کردیں، اور زندگی کے میدان میں یورپ کے ساتھ برابر کی مسابقت کرسکیں۔ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں نظامِ سلطنت کی اصلاح اور فوج کی تنظیم کی۔ اپنی قوم کے ادبیات میں زندگی کی روح پھونکی، نئے مدارس اور کالج قائم کیے اور چند سال کے اندر ایک ایسی نسل تیار کردی جس میں اسلامی تہذیب کے تمام جوہروں کے ساتھ تفکر و تدبر کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ سلطان عبدالعزیز کے عزل (۱۸۷۶ء) تک اس گروہ نے بے شمار خارجی و داخلی مشکلات کے باوجود تعمیرِ قومی کا بہترین کام انجام دیا اور اس کے ثمرات عمر پاشا جیسے مدبر اور نامق کمال اور عبدالحق حمید جیسے سچے مسلمان اہلِ ذکر و ادب کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

لیکن سلطان عبدالحمید نے آکر دفعتاً حرکت کا رخ بدل دیا۔ ۱۸۷۶ء سے لے کر ۱۹۰۹ء تک ۳۳ سال کا زمانہ جس میں ایک دوسری قوم (جاپان) ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اس خود غرض سلطان نے محض اپنے شخصی اقتدار کی خاطر ترکی قوم کی علمی، ذہنی، تمدنی اور سیاسی و تنظیمی ترقی کو روکنے اور اس کی روح کو مردہ کرنے میں صرف کردیا۔ یہاں موقع نہیں کہ اس شخص کے اعمال پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جاسکے مختصر یہ ہے کہ اس نے تعمیر کے بہترین زمانے کو جس کی ایک ایک ساعت بیش قیمت تھی۔ تخریب میں کھودیا۔ اس نے ترکی قوم کے بہترین دماغوں کو برباد کیا۔ جمال الدین افغانی جیسا بے نظیر آدمی اسے ملا اور اس کو بھی اس شخص نے ضائع کردیا۔

مگر سب سے بڑا نقصان جو اس کی بدولت نہ صرف ترکی قوم کو بلکہ دنیائے اسلام کو پہنچا، وہ یہ تھا کہ اس نے خلافت کے مذہبی اقتدار اور رجعت پسند علما و مشائخ کے اثرات کو عہدِ تنظیمات کے ترکی مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں اکھیڑنے اور ترکی قوم کے ادبی و ذہنی ارتقا کو روکنے، اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی اس خود غرضانہ و ناعاقبت اندیشانہ حرکت سے ترکوں کی نئی نسل میں ایک انقلابی بحران پیدا ہوگیا۔ وہ مذہب کو مانع ترقی

سمجھنے لگے۔ اسلامیت سے ان کے دماغ منحرف ہو گئے۔ تاریک خیال علما اور مشائخ سے بجا طور پر جو نفرت ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی، انقلابیت کے جوش میں اُس کا رخ مذہب کی طرف پھر گیا۔ وہ سمجھے اور جاہل علما اور مشائخ نے اُن کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے، زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، اس کے قوانین تغیراتِ احوال کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور بجز چند عقائد کے اس میں کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو اپنے اندر کوئی پائیداری رکھتی ہو۔ اس ۳۳ برس کے استبداد نے جو بدقسمتی سے مذہبی رنگ لیے ہوئے تھا، ترکوں کی نئی نسلوں میں مادّہ پرستی، دہریت، مغرب سے کامل مرعوبیت، مغربی تخیلات کی اندھی تقلید، اپنے ماضی سے نفرت، ہر قدیم چیز سے بیزاری اور خلافت و وحدتِ اسلامی سے (جس کو سلطان عبدالحمید نے اپنی غرض کا آلۂ کار بنایا تھا) کراہتِ تام پیدا کر دی اور ان کے اندر یہ خیال راسخ کر دیا کہ دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لیے تمام پچھلی بنیادوں کو ڈھا کر بالکل مغربی طرز پر ترکیت کا قصر تعمیر کرنا ضروری ہے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے سلطان عبدالحمید خاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، اور سلطنت کی عنانِ اقتدار منحرف ذہنیت رکھنے والے جوشیلے اور مشتعل نوجوانوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ خالدہ ادیب خانم کے بقول یہ لوگ عہدِ تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر و تفکر اور عالی دماغی میں دورِ تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا ہو۔ نہ اُن کے پیشِ نظر وہ بلند نصب العین تھا، نہ ان کی سیرتوں میں وہ مضبوطی تھی، نہ شائستگی اور تربیت کے لحاظ سے ان کا اُن سے کوئی مقابلہ تھا، نہ قومی فخر و ناز کا وہ جذبہ اُن میں موجود تھا، نہ تنقید کی وہ صلاحیت تھی کہ قدیم اور جدید کے صحیح فرق کو سمجھ سکیں۔ یہ چند ایسے نوجوانوں کا مجمع تھا جو اسلامی علوم میں کورے تھے۔ اسلامی تربیت میں ناقص تھے، مغربی علوم میں بھی گہری نظر نہ رکھتے تھے، اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب اور اپنی قدیم اجتماعی تنظیمات کے خلاف ان کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، مغرب کے تقدمات سے مرعوبیت ان کے اندر بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ اپنی ہر چیز کو بدل دینے کے لیے بے چین تھے۔ جب سلطنت ان کے ہاتھوں میں آئی تو یہ بند پانی جس کو ۳۳ برس کی طویل بندش نے بہت کچھ فاسد کر دیا تھا طوفان کی شکل میں پھوٹ نکلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ترکوں کو نیشنلزم

اور تورانی عصبیت کا جن سوار ہوا، وحدتِ اسلامی کی طرف سے سرد مہری ظاہر ہونی شروع ہوئی۔ مذہب پر نکتہ چینی کا آغاز ہوا۔ قدیم تہذیب کو مٹا کر مغربی تہذیب کو بالکلیہ اختیار کر لینے پر زور دیا جانے لگا، ماضی سے تعلق منقطع کرنے اور مغرب سے قریب تر ہونے کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش ہوتی، جدید نظریات کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کے لیے سرکاری علما کا ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ ضیا کوک الپ جیسا شخص تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اتحادِ اسلامی کے مقابلہ میں اتحادِ تورانی کی زبردست تبلیغ کی، ترکوں کو عہدِ اسلامی کی تاریخ اور اس کے نامور بہادروں سے نفرت دلا کر قدیم وحشی تاتاریوں پر فخر کرنا سکھایا، ترکی زبان کو اسلامی ادب کی خصوصیات سے پاک کرنے کی کوشش کی، اور تمدن، معاشرت، تہذیب و اطوار اور عملی زندگی کے تمام طریقوں میں مغرب کی پوری تقلید کرنے پر زور دیا۔ اس قسم کے خیالات رکھنے والا شخص، جدید انقلابی جماعت کا امام مجتہد بن کر اٹھا اور اس نے کوشش شروع کی کہ اپنے متبعین کے ساتھ مل کر اسلامی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرے جس سے چند گنے چنے عقائد اور اخلاقی اصولوں کے سوا اسلام کی ہر چیز کو قابلِ تغیر ثابت کر کے مغربی سانچے میں ڈھال دیا جا سکے۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی، دوسری طرف ترکوں کے علما اور مشائخ تھے جو اَب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ و کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا، وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنا رہے تھے جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر صرف ان مفسرین و محدثین ہی سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کیے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں، خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنتِ رسول میں مقرر کیے گئے ہیں۔

غرض ایک طرف علما اور مشائخ اپنی اس روش پر قائم رہے جو ترکی قوم کو سو برس کے اندر تنظیمات کے مقام سے ہٹا کر انقلابیت کے اس مقام تک کھینچ کر لائی تھی۔ اور دوسری طرف ترکی قوم کے انقلابی لیڈر دل سے مسلمان ہونے کے باوجود، دماغ اور فکر و عمل کی واقعی دنیا میں اسلام سے دور اور دور تر ہوتے چلے جا رہے تھے، اسی زمانہ میں جنگِ عظیم پیش آئی جس میں عرب اور ہندستان کے بدقسمت مسلمانوں نے اعداء اسلام کے ساتھ مل کر ترکوں کے گلے کاٹے۔ پھر جنگِ عظیم کے بعد جب ترکوں نے حیاتِ قومی کو کامل تباہی سے بچانے کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس میں سب سے زیادہ ان کی مخالفت جنھوں نے کی وہ خلیفۂ وقت اور شیخ الاسلام تھے۔ یہ آخری ضربات انقلابی ترک کی نیم جاں اسلامیت کے لیے فیصلہ کن تھیں۔ انہی کا نتیجہ ہے جو آج ہم کو ترکی جدید کی غیر معتدل تجدد پسندی کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں جو انقلابی خیالات ابھی خام تھے اور جن کو جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگِ عظیم اور حملۂ یونان کی مشغولیتوں نے پختہ ہونے سے روک رکھا تھا وہ لوزان کانفرنس کے بعد پختگی کو پہنچ گئے اور عملی شکل اختیار کرنے لگے، تمدن و معاشرت میں کامل مغربیت، زبان اور ادب اور سیاست میں انتہا درجہ کی جنسی عصبیت، انحلائے خلافت کے بعد مذہب کو سلطنت کا پابند بنا دینا، اسلامی قانون کے بجائے سوئیزر لینڈ کا قانون اختیار کرنا، وراثت اور نکاح و طلاق وغیرہ مسائل میں قرآن کے صریح احکام کو بدل ڈالنا، عورتوں کو اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف اس آزادی کی روش پر ڈال دینا جس پر جنگِ عظیم کے بعد یورپ کی عورتیں چل رہی ہیں۔ یہ سب قدرتی نتائج ہیں جاہل علما کے جمود اور اہواء پرست صوفیا کی گمراہی، اور خلافت کے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے سلاطین کی خود غرضی، اور انقلابی لیڈروں کی قرآن اور سنتِ رسول کے علم سے کلی جہالت کے۔ افسوس کہ اس صدی میں ترکی قوم نے ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو قرآن میں بصیرت رکھنے والا اور اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کو سمجھنے والا ہوتا، اور زمانے کے متغیر حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح اجتہادی قوت سے کام لیتا، اور اصولِ اسلام کو ان حالات پر منطبق کر کے ایک ایسا سمویا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب و سنت پر ہوتی، اور جس میں رفتارِ زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار

ہو رہے ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علما و مشائخ ہیں، انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچ سو برس سے اسلام کے لیے تنِ تنہا سینہ سپر تھی اسلامیت سے فرنگیت کی طرف ڈھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب ڈھکیل کر رہیں گے۔ دوسری طرف جدت پسند حضرات اس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا قرآن منسوخ ہو چکا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو گئی، اب ہدایت ہے تو اتاترک کے اسوہ میں اور نورِ علم ہے تو آسمانِ انقرہ سے اتری ہوئی وحی میں۔ حالانکہ بے چارے اتاترک اور اس کے متبعین کا حال ہے کہ

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (الزخرف: ۲۰)

"یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے، محض تیر تکے لڑاتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن، ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ، فروری ۱۹۳۶ء)

عقلیت کا فریب (۱)

اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام نوجوانوں کے مذہبی خیالات پر مغربی تعلیم اور تہذیب کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ ان تحریروں اور تقریروں سے ہوسکتا ہے جو اس قسم کے لوگوں کی زبان و قلم سے آئے دن نکلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر حال ہی میں صوبہ متحدہ کے ایک مسلمان گریجویٹ صاحب کا ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا، جس میں انھوں نے اپنی سیاحتِ چین و جاپان کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہمارے ساتھ جو چینی مسافر ہیں وہ انتہا کے بلانوش اور شراب خور ہیں۔ سور کا گوشت تو اُن کی جان ہے۔ اب میں نے عیسائیت کی ترقی کا راز سمجھا۔ چین اپنے قدیم مذہب کی پیروی کو نئی تعلیم کے ساتھ عار پاتا ہے۔ اس کو اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر وہ اس کو سمجھتا ہوتا۔ مگر اسلام اس کو اس کی تمام مرغوب غذاؤں سے محروم کر دیتا ہے۔ چار و ناچار وہ عیسائی ہو جاتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ آئندہ چین کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو جائے۔ میں سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے نومسلموں کے ساتھ ذرا ڈھیل دینا پسند کرتا ہوں۔ قرآن سے بھی مجھے اس کے قطعی حرام ہونے میں شک ہے۔ زیادہ بریں نیست کہ اہلِ عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسے ممالک میں جہاں اس کے بغیر فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟''

''بہر حال قرآن کا یہی ایک حکم ہے جس کی ممانعت عمومی کی علت میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی ورنہ اصولِ معدہ اور محرکات اخلاق میں اس قدر بُعد ہے کہ مذہب

ہمارے کھانے کا مینو (Menu) بھی تیار کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم کو آہن گری اور زرگری و خیاطی وغیرہ کا کام بھی کیوں نہ سکھائے؟ میرا خیال ہے کہ دنیا میں اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ وہ آدمی کے تمام حقوقِ انسانی کو سلب کر کے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور ایسا بے حس بچہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ترقی کی راہ میں سب بھول جاتا ہے۔ ورنہ مذہب در حقیقت اسی قدر ہونا چاہیے جیسا کہ عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے۔''

اس کے بعد وہ شنگھائی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدا کی اس بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر دل گواہی نہیں دیتا کہ یہ تمام کے تمام چند سال کے بعد دوزخ کے ایندھن بنائے جائیں گے۔ گویا ان کی پیدائش کا یہی ایک مقصد خدا کے پاس رہ گیا ہے۔ پھر وہ سب کے سب اِلّا ماشاء اللہ چند نفوس کے علاوہ اگر بت پرست اور کافر ہیں تو انھوں نے دوزخ میں رکھے جانے کے لیے کیا یہی قصور کیا ہے کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دیا ہے؟ نہ وہ حاجیوں کو قتل و غارت کرتے ہیں، نہ اُن میں قومِ لوط کا عمل ہے، نہ وہ کسی کے مال کو ہضم کر لیتے، اور نہ اس کو جائز کرنے کے لیے تاویلیں کرتے ہیں، خاموشی سے اس زندگی کو بحسن و خوبی طے کر رہے ہیں۔ پھر بھی وہ مستحق دوزخ ہیں۔ آخر کیوں؟... یقیناً مشرکانہ عقیدہ ایک سودائے خام ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر ایک شخص ایسی ہستی کا فطرۃً قائل ہو جاتا ہے جو اس کو مارتی اور جلاتی ہے تو محض اس لیے کہ اس کی ماہیت اس کی سمجھ سے اتنی ہی باہر ہے جتنی ہماری سمجھ سے، یا وہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا، تم اس کے دشمن ہو اور وہ تمہارا دشمن ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں تمہارے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے ضروری تو یہ ہے کہ پائجامہ ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو۔ فلاں قسم کا کھانا کھائے۔ منہ پر چار انگل کی داڑھی ہو۔ کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم نہ رکھے اس واسطے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن تم کو نہیں سکھایا جاتا۔''

جاپان کے بندرگاہ کوبے کے متعلق فرماتے ہیں:

''دو گھنٹہ تک میں کوبے میں پھرتا رہا۔ ایک بھیک مانگنے والا مجھ کو نہ ملا اور نہ کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں بدحال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے

اور نہ خدا کو"

پھر وہ بقولِ خود "موعظہ حسنہ" شروع کرتے ہیں:

"یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں۔ اس کا فطری مقصود یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہوں گے۔ یہی دراصل مذہب اسلام ہے۔ اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب کا نام دے رکھا ہے وہ محض تمہارے نفس کا دھوکا ہے یا تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ جس روز ان دونوں باتوں پر مذہب کو محدود کر دو گے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈالو گے تم بھی قوموں کے ساتھ بامِ ترقی پر پہنچو گے۔ بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں ضمیر پیدا کر دو گے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت بھی نہ جائے گی۔ تم خود کوئی قوم نہیں ہو بلکہ قوموں کے مصلح ہو۔ مگر خدا را اس کے کہنے کا موقع نہ دو کہ فلاں قوم برسرِ اوج ہے، مگر جو ان میں مسلمان ہیں ان کی حالت زبوں ہے، اور یقیناً اس زبونی کا ذمہ دار کا عجیب و غریب مذہب ہے۔"

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام دماغی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہوئے، مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پلے بڑھے، مسلمانوں کے ساتھ معاشرت و تمدن کی بندشوں میں بندھے، اس لیے اسلام کی محبت، مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، اور مسلمان رہنے کی خواہش گویا ان کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں اس طرح بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے اور اپنی عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا مگر قبل اس کے کہ اس اضطراری اور غیر شعوری اسلام کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اختیاری اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے، اور عملی زندگی میں اس کے احکام و قوانین کو برت کر بھی دیکھ لیتے، انھیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں اُن کے قوائے ذہنی و فکری کی پرورش بالکل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے، اور مغربیت کے اس استیلاء سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب سے انھوں نے عقلیت (Rationalism) کا

سبق سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بالکل یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی۔ اس لیے ان کی عقلیت دراصل فرنگی عقلیت ہو گئی نہ کہ آزاد عقلیت۔ انھوں نے مغرب سے تنقید (Criticism) کا بھی درس لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا بلکہ اس چیز کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد جب یہ لوگ کالجوں سے فارغ ہو کر نکلے اور زندگی کے میدانِ عمل میں انھوں نے قدم رکھا تو اُن کے دل اور دماغ میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھے اور دماغ غیر مسلم۔ رہتے مسلمانوں میں تھے، شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے، تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، اپنے گرد و پیش مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی زندگی کے اعمال دیکھ رہے تھے، ہمدردی و محبت کے رشتے مسلمانوں سے وابستہ تھے، مگر سوچنے اور سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی جتنی قوتیں تھیں وہ سب مغربی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں جن سے نہ اسلام کا کوئی قاعدہ مطابقت رکھتا تھا اور نہ مسلمانوں کا کوئی عمل۔ اب انھوں نے مغربی معیار کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی ہر چیز پر تنقید شروع کی۔ اور ہر اُس چیز کو غلط اور قابلِ ترمیم سمجھ لیا جسے اس معیار کے خلاف پایا، خواہ وہ اسلام کے اصول و فروع میں سے ہو، یا محض مسلمانوں کا عمل ہو۔ ان میں سے بعض نے تحقیقِ حال کے لیے کچھ اسلام کا مطالعہ بھی کیا۔ مگر تنقید و تحقیق کا معیار وہی مغربی تھا۔ ان کی ذہنیت کے ٹیڑھے سوراخ میں اسلام کی سیدھی میخ آخر بیٹھتی تو کیوں کر؟

مذہبی مسائل پر جب یہ حضرات اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے تقریر فرما رہے ہیں، نہ اُن کے مقدمات درست ہوتے ہیں، نہ منطقی اسلوب پر ان کو ترتیب دیتے ہیں، اور نہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کلام کرتے وقت خود اپنی پوزیشن بھی متعین نہیں کرتے۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں مختلف حیثیتیں اختیار کر جاتے ہیں۔ ابھی ایک حیثیت سے بول رہے تھے کہ دفعتاً ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی اور پچھلی حیثیت کے خلاف بولنے لگے، سستی فکر (Loose-thinking) ان کے مذہبی ارشادات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب کے علاوہ جس مسئلے پر بھی بولیں گے ہوشیار اور چوکنے ہو کر بولیں گے کیوں کہ وہاں اگر کسی قسم کی بے ضابطگی ہو گئی تو جانتے ہیں کہ اہلِ علم کی نگاہ

میں کوئی وقعت باقی نہ رہے گی۔ لیکن مذہب چوں کہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور اس کو وہ اتنا وزن ہی نہیں دیتے کہ اس پر کلام کرتے وقت اپنے دماغ پر زور دینا ضروری سمجھیں اس لیے وہ یہاں بالکل بے فکری کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی گفتگو فرماتے ہیں، گویا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہیں اور محض تفریح کے طور پر بول رہے ہیں جس میں ضوابطِ کلام کو ملحوظ رکھنے کی کوئی حاجت نہیں۔

دوسری بات جو ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے، وہ خیالات کی سطحیت اور معلومات کی کمی ہے۔ مذہب کے سوا کسی اور مسئلے میں وہ اتنی کم معلومات اور اس قدر کم غور و فکر کے ساتھ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اگر تحقیق کے بغیر ایک کلمہ منہ سے نکل جائے تو آبرو جاتی رہے لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ تحقیق اور مطالعہ اور غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو گیا اس پر رائے قائم کر لی اور بے تکلف اس کو بیان کر دیا۔ اور مولوی کے متعلق یہ بات پہلے ہی اصولِ موضوعہ کے طور پر داخلِ مسلمات ہو چکی ہے کہ وہ تاریک خیال، دقیانوسی اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

فاضل مضمون نگار کی زیرِ نظر تحریر، چشم بد دور اِن دو خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے مضمون سے یہی نہیں معلوم ہوتا کہ مسلم کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے۔ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے والے کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں: مسلم ہو گا یا غیر مسلم۔ جو شخص مسلم کی حیثیت سے کلام کرے گا عام اس سے کہ وہ خوش عقیدہ (Orthodox) ہو، یا آزاد خیال، یا اصلاح طلب بہر حال اس کے لیے لازم ہو گا کہ دائرۂ اسلام کے اندر رہ کر کلام کرے، یعنی قرآن کو منتہائے کلام (Final Authority) سمجھے اور ان اصولِ دین وقوانینِ شریعت کو تسلیم کرے جو قرآن نے مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ قرآن کی سند کو نہ مانے گا اور کسی ایسی بات میں کلام کی گنجائش سمجھے گا جو قرآن سے ثابت ہو، تو دائرۂ اسلام سے باہر نکل آئے گا، اور اس دائرے سے نکلنے کے بعد اس کی مسلمانانہ حیثیت باقی نہ رہے گی کہ وہ اس میں کلام کر سکے۔ رہی دوسری حیثیت یعنی یہ کہ بولنے والا غیر مسلم ہو تو اس حیثیت میں اسے پورا حق ہو گا کہ قرآن کے اصول اور اس کے احکام پر جیسی چاہے تنقید کرے۔ اس لیے کہ وہ اس کتاب کو منتہائے کلام نہیں مانتا، لیکن یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد اسے مسلم کی حیثیت سے گفتگو کرنے اور مسلمان بن کر مسلمانوں کو اسلام کے معنیٰ سمجھانے اور اسلام کی ترقی کے وسائل بتلانے کا کوئی

حق نہیں ہو گا۔ ایک صاحبِ عقل وشعور آدمی جب سوچ سمجھ کر اسلام کے متعلق گفتگو کرے گا تو وہ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کون سی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ پھر وہ جو حیثیت بھی اختیار کرے گا اس کے عقلی شرائط کو ملحوظ رکھے گا۔ کیوں کہ بیک وقت اپنے آپ کو مسلمان بھی کہنا اور قرآن کے مقرر کیے ہوئے اصول وقوانین پر نکتہ چینی کا حق بھی استعمال کرنا، قرآن کی سند میں کلام بھی کرنا اور مسلمانوں کو موعظۂ حسنہ بھی سنانا کسی عاقل کا فعل نہیں ہو سکتا۔ یہ نقیضین کو جمع کرنا ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایک شخص بیک وقت مسلم بھی ہو اور غیر مسلم بھی، دائرۂ اسلام کے اندر بھی ہو اور باہر بھی۔

مضمون نگار صاحب کی علمی قابلیت اور ان کی معقولیت کی طرف سے ہم اتنے بدگمان نہیں ہیں کہ ان سے یہ امید رکھیں کہ اگر وہ اسلام کے سوا کسی مسئلہ پر کلام فرماتے تو اس میں بھی اس طرح دو مختلف حیثیتوں کو بیک وقت اپنے اندر جمع کرتے۔ ہم اُن سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ قیصرِ ہند کی عدالت میں بیٹھ کر قیصرِ ہند کے امضاء کیے ہوئے قوانین پر نکتہ چینی کرنے کا حق استعمال فرمائیں گے، نہ ہم ان سے اس جرأت کی امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی مذہبِ فکر (School of Thought) کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد ان اصولوں پر مخالفانہ نکتہ چینی کریں گے جن پر وہ مذہب قائم ہے لیکن طرفہ ماجرا ہے کہ اسلام کے معاملہ میں انھوں نے دو بالکل مختلف حیثیتیں اختیار کی ہیں اور یہ محسوس تک نہیں کیا کہ وہ بار بار اپنی پوزیشن بدل رہے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسلمانوں کو ''احسان'' یعنی ''اصلِ دین'' کا وعظ سناتے ہیں۔ دوسری طرف اس کتاب کے مقرر کیے ہوئے اصول اور قوانین پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس کو آخری سند تسلیم کرنا مسلمان ہونے کی لازمی شرط ہے۔ قرآن ایک نہیں چار جگہ بالتصریح سؤر(۱) کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے مگر آپ اس معاملہ میں ڈھیل دینا پسند فرماتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ڈھیل دینے کی یہ خواہش بھی ''ترقیِ اسلام'' کے لیے ہے، گویا ترقیِ اسلام کی فکر آپ کو قرآن سے بھی زیادہ ہے! یا کوئی اسلام قرآن سے باہر بھی ہے جس کی ترقی آپ چاہتے ہیں! قرآن فی الواقع انسان کے لیے کھانے کا مینو تیار کرتا ہے، کھانے کی چیزوں میں حرام وحلال، خبیث وطیب کا فرق قائم کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ تم اپنے اختیار سے کسی شے کو

(۱) ملاحظہ ہو البقرہ: ۱۷۳۔ المائدہ: ۳۔ الانعام: ۱۴۵۔ النحل: ۱۱۵

حلال اور حرام قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔(۱) مگر آپ کو اپنے حق پر اصرار ہے اور خود قرآن کا یہ حق تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ کھانے پینے میں مذہب کو دخل دے، قرآن مذہب کو ان حدود میں نہیں رکھتا جن میں سینٹ پال (نہ کہ مسیح) کے متبعین نے اس کو محدود کیا ہے۔ وہ لباس، اکل و شرب، نکاح وطلاق، وراثت، لین دین، سیاست، عدالت، تعزیرات وغیرہ کے قوانین وضع کرتا ہے مگر آپ اس قسم کی قانون سازی کو غلط سمجھتے ہیں، اس کو ترقیِ اسلام میں مانع قرار دیتے ہیں، اور تجویز کرتے ہیں کہ مذہب اسی قدر رہنا چاہیے، جس قدر عیسائیوں (دراصل پولوسیوں) نے سمجھا ہے۔ قرآن نے خود قوانینِ شریعت بنائے ہیں اور ان کو حدود اللہ سے تعبیر کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا ہے، مگر آپ شریعت کی حدوں کو بیڑیوں سے تعبیر کرتے ہیں اور سینٹ پال کی طرح مذہب کی توسیع وترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان بیڑیوں کو توڑ ڈالا جائے۔ قرآن کے نزدیک، ایمان نجات کی پہلی اور لازمی شرط ہے اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے ان کے متعلق وہ بالفاظِ صریح کہتا ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے۔(۲) خواہ وہ بے شمار ہوں یا شمار میں آجائیں، خوش حال ہوں یا بدحال، مگر آپ کا یہ حال ہے کہ کافروں اور بت پرستوں کی بے شمار خلقت کو خوش وخرم وخوش حال دیکھ کر آپ کا دل گواہی نہیں دیتا کہ چند سال کے بعد وہ سب دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے، اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دینے کے سوا اور کون سا قصور کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے رہ سکتے ہیں، اور مسلمان ہوتے ہوئے قرآن سے اختلاف کیوں کر کر سکتے ہیں؟! اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف نہ فرمایئے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتے ہیں تو دائرۂ اسلام سے باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجیے۔

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام وقوانین سے مطمئن نہ ہو، جس کا دل ان کی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو، جو ان کی علت ومصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر باتیں قابلِ اعتراض ہوں اس کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں، یا تو وہ اس مذہب سے نکل جائے پھر اس کو حق ہوگا کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چاہے نکتہ چینی

(۱) اور جو کچھ تمہارے منہ میں آئے جھوٹ موٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے۔ (سورۂ نحل:۱۱۶)

(۲) اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ (سورۂ انبیاء:۹۸)

کرے، یا پھر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف مظاہرہ کرنے سے احتراز کرے اور مجتہد بن کر اس کے قواعد وضوابط پر تیشہ چلانے کے بجائے طالب علم بن کر اپنے شکوک وشبہات حل کرنے کی کوشش کرے۔ عقل ودانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے معقول ہو سکتے ہیں اور مردِ عاقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہوگا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔ لیکن فاضل مضمون نگار اور ان کی طرح بہت سے فرنگی تعلیم وتربیت پائے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انھیں شرم آتی ہے، اس لیے انھوں نے بیچ کا ایک غیر معقول طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں۔ ترقیِ اسلام کے آرزومند بھی ہوتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے درد میں تڑپتے بھی ہیں۔ اور دوسری طرف اسلام کے خلاف وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے۔ حدیث وفقہ تو درکنار قرآن تک پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگا جاتے ہیں جن پر اسلام قائم ہے۔ ان حضرات کو دعویٰ ہے کہ ہم اربابِ عقل (Rationalist) ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں مان سکتے جو عقل کے خلاف ہو۔ ملانوں پر ان کا سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ مگر خود ان کا حال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں صریح متناقض باتیں کرتے ہیں، متضاد طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اور اپنی ایک بات کی تردید خود اپنی ہی دوسری بات سے کر جاتے ہیں۔ آخر یہ ریشنلزم کی کون سی قسم ہے جس کی ایجاد کا شرف ان روشن خیال محققین کو حاصل ہوا ہے۔

اب ذرا ان کی معلومات کی وسعت اور فکر کی گہرائی ملاحظہ فرمایئے:

اسلام کی ترقی کے لیے آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیحیت کی طرح اسلام سے بھی شرعی حدود اٹھا دی جائیں اور اسلام صرف ایک عقیدہ کی حیثیت میں رہ جائے۔ کیوں کہ مسیحیت کی ترقی کا راز جو آپ نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حرام وحلال کی قیود نہیں ہیں، اخلاقی پابندیاں نہیں ہیں، اس میں آدمی کے انسانی حقوق سلب کر کے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور بے بس بچہ نہیں بنایا گیا ہے۔ بلکہ اس کو آزادی دے دی گئی ہے کہ مسیح پر ایمان رکھ کر جو چاہے کرے۔ مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ قرآن میں ہے اور قرآن نے ایمان وعملِ صالح

کے مجموعہ کا نام اسلام رکھا ہے۔ عملِ صالح کے لیے قیود مقرر کیے ہیں، قوانین بنائے ہیں اور انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظامِ عمل مقرر کیا ہے جس کے بغیر اسلام بحیثیت ایک دین اور ایک تہذیب کے قائم نہیں ہوسکتا۔ اس نظام اور اس کی حدود کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں ہے کیوں کہ اس کا نسخ قرآن کا نسخ ہے، اور قرآن کا نسخ اسلام کا نسخ ہے، اور جب اسلام خود ہی منسوخ ہوجائے تو اس کی ترقی کے کیا معنیٰ؟ آپ خود کسی مذہب کو ایجاد کر کے اس کی اشاعت فرما سکتے ہیں مگر جو چیز قرآن کے خلاف ہے اس کو اسلام کے نام سے موسوم کرنے اور اس کی ترقی کو اسلام کی ترقی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟

آپ اسلام صرف اس عقیدہ کا نام رکھتے ہیں کہ ''ہم آئندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہوں گے۔'' یہ بات غالباً آپ نے اس امید پر فرمائی ہے کہ اگر اسلام اس حد میں محدود ہوجائے گا تو بالکل نرم اور آسان ہوجائے گا اور خوب پھیلتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر آپ اس عقیدہ کے معنیٰ پر غور فرماتے تو آپ کو معلوم ہوجاتا کہ اس حد میں محدود ہونے کے بعد بھی اسلام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ اس عقیدے کو مذہب قرار دینے کے لیے سب سے پہلے تو حیاتِ اخروی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر جواب دہی کا مفہوم تین باتوں کا متقاضی ہے۔ ایک یہ کہ جس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے اس کو متعین کرلیا جائے، اور اس کی بالادستی تسلیم کرلی جائے۔ دوسرے یہ کہ جواب دہی کی نوعیت متعین کی جائے اور زندگی کے اعمال میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جائے کہ کن اعمال سے اس جواب دہی میں کامیابی نصیب ہوگی اور کون سے اعمال ناکامی کے موجب ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ جواب دہی میں کامیابی اور ناکامی کے جداجدا نتائج متعین کیے جائیں۔ کیوں کہ اگر ناکامی کا نتیجہ بھی وہی ہو جو کامیابی کا ہے، یا سرے سے دونوں کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو تو جواب دہی بالکل بے معنی ہے۔ یہ اس عقیدے کے عقلی لوازم ہیں جس کو آپ اصل دین قرار دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی تجویز کے مطابق اسی عقیدہ پر اسلام قائم کردیا جائے تب بھی وہی مصیبت پیش آئے گی، جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ پھر وہی خدا کو ماننا لازم آئے گا جس کے بغیر جاپان آپ کو ترقی کے بام پر چڑھتا ہوا نظر آرہا ہے۔ پھر وہی شریعت کی بیڑیاں اور اخلاق کی زنجیریں تیار ہوجائیں گی جن کو آپ توڑنا چاہتے ہیں اور جن کے وجود میں آپ کے نزدیک اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ پھر وہی عذاب د

ثواب کا جھگڑا نکل آئے گا اور خدا کی بے شمار خلقت کو اس عقیدے کے بغیر خوش وخرم وخوش حال دیکھ کر آپ کا دل پھر اس بات پر گواہی دینے سے انکار کردے گا کہ چند سال بعد یہ سب عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

براہِ کرم اب ذرا غور کر کے کسی ایسی چیز کا نام اسلام رکھیے جس میں کسی قسم کی قیود وبند نہ ہو، جس کو ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ یکساں ہو، جس میں صرف خدا کی زمین کو معمور کردینا دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے کافی ہو، اور جس پر ایمان نہ لانے والی بے شمار خلقت کو خوش وخرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل گواہی دے سکے وہ سب جنت کی بلبلیں بنائی جائیں گی۔

قرآن کی رو سے سور کے گوشت کا قطعی حرام ہونا آپ کے نزدیک مسلم نہیں ہے۔ آپ شک فرماتے ہیں کہ شاید اہلِ عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کردیا گیا ہوگا۔ لیکن اگر آپ اس رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے قرآن کھول کر پڑھ لیتے تو اس شک کی تحقیق ہوجاتی۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٥﴾ (الانعام: ۱۴۵)

''اے پیغمبر کہو کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں تو کسی چیز کو جسے کوئی کھانے والا کھانے میں حرام نہیں پاتا اِلّا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون، یا سور کا گوشت ہو، کیوں کہ وہ بہ تحقیق ناپاک ہے یا نافرمانی کے طور پر اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح کیا گیا ہو پھر جو شخص مجبور ہوگیا بغیر اس کے کہ وہ نافرمان اور حدِ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو تیرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

اس آیت میں سور کے گوشت کو ہر ''طاعم'' یعنی کھانے والے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اور حرمت کی علت یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ ''رجس'' (ناپاک) ہے۔ کیا یہاں طاعم سے مراد عرب کا طاعم ہے؟ اور کیا ایک ہی چیز عرب کے لیے رجس اور غیر عرب کے لیے طیب وطاہر ہوسکتی ہے؟ اور کیا اسی طریقہ سے آپ مردار کھانے والوں کے لیے بھی ذرا ڈھیل دینا پسند فرمائیں گے؟

آپ سور کے معاملہ میں ڈھیل چاہتے ہیں تو خود اپنی طرف سے دیجیے، مگر قرآن کے صریح الفاظ کے خلاف آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ قرآن سے اس کی قطعی ممانعت مشکوک ہے؟

آج کل کے نئے مجتہدین نے اجتہاد کے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کے جس حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ یہ حکم خاص اہل عرب کے لیے تھا، خواہ قرآن میں اس تخصیص کی طرف کوئی ذرا سا اشارہ بھی نہ ہو اور تخصیص کے لیے وہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بعید نہیں کہ ایک روز قرآن ہی کو اہل عرب کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے استدلال تو اتنا لطیف ہے کہ صاحبِ سفر نامہ کے علم و فضل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ غالباً اسی آیت کا ترجمہ انھوں نے یہ کیا ہوگا کہ ’’جب سور کا گوشت کھانے کو بے اختیار جی چاہے تو کھالو مگر باغ میں بیٹھ کر نہ کھا اور نہ اس کی عادت ڈالنا۔‘‘ سور کے گوشت کے معاملہ میں اہلِ یورپ اور اہلِ چین کے ڈھیل دینے کی گنجائش اس آیت سے وہی شخص نکال سکتا ہے جو نہ اضطرار کے معنیٰ جانتا ہو، نہ باغی کا مفہوم سمجھتا ہو، اور نہ عادی کا۔ ورنہ جاننے والے کے لیے تو اتنی جرأت کرنا بہت مشکل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ جن لوگوں کو مردار خوری یا خون آشامی کا چسکا لگا ہوا ہو یا جو لوگ سور کے گوشت پر جان دیتے ہوں، یا جن کے ہاں وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ(۱) کے کھانے کا عام دستور ہو یا وہ سب مجبوروں میں داخل ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تحریم کا حکم ہی بے معنیٰ ہو جاتا۔ کیوں کہ اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو اُن چیزوں کے خوگر تھے۔ تو استثناء سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی عادت کے مطابق انھیں کھاتے رہتے، اور اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو خود ہی ان سے مجتنب تھے تو ان کے لیے اس حکم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اضطرار (مجبوری) کے ساتھ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط لگا کر جو استثناء کیا گیا ہے اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو، اور حرام چیز کے سوا کوئی چیز اس کو نہ ملتی ہو، وہ محض جان بچانے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ حدِ رخصت سے تجاوز نہ کرے، یعنی جان بچانے کے لیے جتنی مقدار ناگزیر ہو اس سے زیادہ نہ کھائے اور حدود اللہ کے توڑنے کی خواہش اس کے دل میں نہ ہو۔ اسی بات کو ایک دوسری جگہ سور اور مردار وغیرہ چیزوں کو تحریم کا ذکر کرتے ہوئے اس کا بیان کیا گیا ہے، فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ

(۱) خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا ہوا۔ (البقرہ: ۱۷۳)

مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ (المائدہ: ۵) یعنی جو شخص بھوک کی شدت سے مجبور ہو جائے بغیر اس کے گناہ کی طرف کوئی میلان اس کے دل میں ہو وہ ایسی حالت میں حرام چیز کھا سکتا ہے۔ کہاں یہ بات اور کہاں وہ کہ اہلِ یورپ اور اہلِ چین چوں کہ سور کے گوشت پر جان دیتے ہیں لہٰذا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے فائدہ اٹھا کر اُن کے لیے سور کو جائز کر دیا جائے اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔ اگر کسی طریقہ سے ہر قوم کی رغبتوں اور خواہشوں کا لحاظ کر کے اسلام کے قوانین میں ڈھیل دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو شراب، جوا، زنا، سود اور ایسی ہی دوسری تمام چیزوں کو ایک ایک کر کے حلال کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام کو ماننے اور اس کے قایم کیے ہوئے حدود کی پابندی کرنے اور اس کے حرام کو حرام سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اسلام میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسلام ان کا محتاج کب ہے کہ وہ ان کو راضی کرنے کے لیے کم و بیش پر سودا کرے؟

پہلے تو صرف سور ہی حرام ہونے کی علّت آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر پھر جو آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اصولاً معدہ اور محرکاتِ اخلاق میں بونِ بعید ہے۔ لہٰذا آپ نے یہ رائے قائم فرمائی کہ مذہب کو کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کا امتیاز قائم کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ اس ارشاد سے راز فاش ہو گیا کہ آپ جتنا قرآن کے متعلق جانتے ہیں، حکمتِ طبیعی (Physical Science) کے متعلق بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ قرآن سے ناواقف ہونا تو خیر ایک ’’روشن خیال تعلیم یافتہ آدمی‘‘ کے لیے شرم ناک نہیں ہے مگر سائنس سے اتنی بے خبری البتہ بہت شرم ناک ہے۔ آپ کو اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ انسان کے نفس اور اس کی ترکیبِ جسمانی کے درمیان کیا تعلق ہے، اور اس کی ترکیب جسمانی غذا سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ جو چیز جسم کو اس کے ضائع شدہ اجزائے ترکیبی فراہم کرتی ہے، جس سے بدن کے تمام ریشے اور اعصاب از سرِ نو بنتے ہیں جو چند سال کے اندر پرانے جسم کی جگہ نیا جسم پورا کا پورا بنا دیتی ہے، اس کی خصوصیات کا اثر نفس اور روح پر ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا قابلِ تعجب ہے۔ اس حقیقت سے سائنٹفک دنیا پہلے عموماً غافل تھی، مگر فن تغذیہ (Dietetics) پر حال میں جو تحقیقات ہوئی ہیں اُن سے یہ راز منکشف ہو گیا ہے کہ انسان کے اخلاق اور اس کی ذہنی قوتوں پر اس کی غذا کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے۔ چناں چہ آج کل کے حکماء اس تجسس میں لگے ہوئے ہیں کہ مختلف قسم کی غذاؤں

سے ہمارے نفس اور قوائے فکری پر کیا اثرات ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گریجویٹ دوست کی سائنٹفک معلومات تازہ (Up-to-date) نہیں ہیں، ورنہ وہ اتنی جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ نہ کر دیتے کہ اصولاً معدہ اور محرکاتِ اخلاق میں بُعد ہے۔

(ترجمان القرآن۔ شعبان ۵۳ھ۔ دسمبر ۱۹۳۴ء)

عقلیت کا فریب (۲)

عقلیت (Rationalism) اور فطریت (Naturalism) یہ دو چیزیں ہیں، جن کا اشتہار گزشتہ دو صدیوں سے مغربی تہذیب بڑے زور شور سے دے رہی ہے۔ اشتہار کی طاقت سے کون انکار کرسکتا ہے؟ جس چیز کو پیہم اور مسلسل اور بکثرت نگاہوں کے سامنے لایا جائے اور کانوں پر مسلط کیا جائے اس کے اثر سے انسان اپنے دل اور دماغ کو کہاں تک بچاتا رہے گا۔ بالآخر اشتہار کے زور سے دنیا نے یہ بھی تسلیم کرلیا کہ مغربی علوم اور مغربی تمدن کی بنیاد سراسر عقلیت اور فطریت پر ہے۔ حالانکہ مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ اس کی بنیاد نہ عقلیت پر ہے نہ اصولِ فطرت کی متابعت پر، بلکہ اس کے برعکس اس کا پورا ڈھچر حس اور خواہش اور ضرورت پر قائم ہے۔ اور مغربی نشأۃِ جدیدہ دراصل عقل اور فطرت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس نے معقولات کو چھوڑ کر محسوسات اور مادّیات کی طرف رجوع کیا۔ عقل کے بجائے حس پر اعتماد کیا۔ عقلی ہدایات اور منطقی استدلال اور فطری وجدان کو رد کرکے محسوس مادّی نتائج کو اصلی و حقیقی معیار قرار دیا۔ فطرت کی رہنمائی کو مردود ٹھہرا کر خواہش اور ضرورت کو اپنا رہنما بنایا۔ ہر اس چیز کو بے اصل سمجھا جو ناپ اور تول میں نہ آسکتی ہو۔ ہر اس چیز کو ہیچ اور ناقابلِ اعتناء قرار دیا جس پر کوئی محسوس مادّی منفعت مرتب نہ ہوتی ہو۔ ابتدا میں یہ حقیقت خود اہلِ مغرب سے چھپی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ عقل اور فطرت کے خلاف چلنے کے باوجود یہی سمجھتے رہے کہ انھوں نے جس ''روشن خیالی'' کے دورِ جدید کا افتتاح کیا ہے اس کی بنیاد ''عقلیت'' اور ''فطرت'' پر ہے۔ بعد میں اصل حقیقت کھلی مگر اعتراف کی جرأت نہ ہوئی۔ مادّہ پرستی، اور خواہشات کی غلامی، اور مطالباتِ نفس وجسد کی بندگی پر منافقت کے ساتھ عقلی استدلال او

ادعائے فطریت کے پردے ڈالے جاتے رہے۔ لیکن اب انگریزی محاورے کے مطابق ہی ''بلی تھیلے سے بالکل باہر آچکی ہے۔'' غیر معقولیت اور خلاف ورزی کی لے اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس لیے اب کھلم کھلا عقل اور فطرت دونوں سے بغاوت کا اعلان کیا جارہا ہے۔ علم اور حکمت کی مقدس فضا سے لے کر معاشرت، معیشت اور سیاست تک ہر جگہ بغاوت کا علم بلند ہوچکا ہے اور ''قدامت پرست'' منافقین کی ایک جماعت کو مستثنیٰ کرکے دنیائے جدید کے تمام رہنما اپنی تہذیب پر صرف خواہش اور ضرورت کی حکمرانی تسلیم کررہے ہیں۔

مشرقی متغربین ومتفرنجین اپنے پیشواؤں سے ابھی چند قدم پیچھے ہیں، اُن کا دماغی نشوونما جس تعلیم اور جس ذہنی فضا اور جن عواملِ تہذیب وتمدن کے زیرِ اثر ہوا ہے ان کا اقتضا یہی ہے کہ وہی محسوسات و مادّیات کی پرستش اور خواہشات وضروریات کی غلامی ان میں بھی پیدا ہو اور فی الواقع ایسا ہی ہورہا ہے۔ مگر ابھی تک یہ اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں بلی تھیلے سے باہر آجائے۔ اپنی تحریر وتقریر میں یہ اب بھی کہے جارہے ہیں کہ ہم صرف عقل اور فطرت کی رہنمائی تسلیم کرتے ہیں، ہمارے سامنے صرف عقلی استدلال پیش کرو، ہم کسی ایسی چیز کو نہ مانیں گے جو عقلی دلائل اور فطرت شواہد سے ثابت نہ کردی جائے۔ لیکن ان تمام بلند آہنگیوں کے تھیلے میں وہی بلی چھپی ہوئی ہے جو نہ عقلی ہے اور نہ فطری، ان کے مقالات کا تجزیہ کیجیے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ معقول اور فطری وجدانیات کے ادراک سے ان کے ذہن عاجز ہیں۔ جس کو یہ ''عقلی فائدہ'' کہتے ہیں، اس کی حقیقت پوچھیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد ''تجربی فائدہ'' ہے اور تجربی فائدہ وہ ہے جو ٹھوس ہو، وزنی ہو، شمار اور پیمائش میں آسکے۔ کوئی چیز جس کا فائدہ ان کو حسابی اعداد سے گن کر، یا ترازو کے پلڑوں سے تول کر، یا گز سے ناپ کر نہ بتایا جاسکے، اس کو یہ مفید نہیں مان سکتے۔ اور جب تک اس معنی میں اس کی افادیت ثابت نہ کردی جائے اس پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا ان کے نزدیک ایسا فعل ہے جس کو یہ غیر معقولیت سے تعبیر کرتے ہیں، فطرت کی رہنمائی جس کی پیروی کا ان کو دعویٰ ہے اس کی حقیقت بھی تھوڑی سی جرح میں کھل جاتی ہے، فطرت سے مراد اُن کے نزدیک انسانی فطرت نہیں بلکہ حیوانی فطرت ہے جو وجدان اور شہادتِ قلبیہ سے خالی ہے اور صرف حس، خواہش اور مطالباتِ نفس وجسد ہی رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اعتبار کے قابل صرف وہی چیزیں ہیں جو حواس کو متاثر کرسکیں، خواہشات کو تسکین دے

سکیں، جسمانی یا نفسانی مطالبات کو پورا کرسکیں، جن کا فائدہ فوراً مشاہدہ میں آجائے اور جن کا نقصان نظروں سے اوجھل ہو یا فائدہ کے مقابلہ میں ان کو کم نظر آئے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو فطرتِ انسانی کے مقتضیات سے ہیں جن کی اہمیت کو انسان اپنے وجدان میں پاتا ہے جن کے فائدے یا نقصانات مادّی اور حسی نہیں بلکہ نفسی اور روحانی ہیں، وہ اوہام اور خرافات ہیں، ہیچ اور ناقابلِ اعتناء ہیں، ان کو کسی قسم کی اہمیت دینا بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی تاریک خیالی، وہم پرستی اور دقیانوسیت ہے۔ ایک طرف عقل وفطرت سے یہ انحراف ہے، دوسری طرف عقلیت و فطریت کا دعویٰ ہے، اور عقل کے دیوانہ پن کا حال یہ ہے کہ وہ اس اجتماعِ ضدین کو محسوس تک نہیں کرتی۔

تعلیم اور تہذیبِ فکر کا کم سے کم اتنا فائدہ تو ہر انسان کو حاصل ہونا چاہیے کہ اس کے خیالات میں الجھاؤ باقی نہ رہے، افکار میں پراگندگی اور ژولیدگی نہ ہو۔ وہ صاف اور سیدھا طریقِ فکر اختیار کرسکے۔ مقدمات کو صحیح ترتیب دے کر صحیح نتیجہ اخذ کرسکے، تناقض اور خلط مبحث جیسی صریح غلطیوں سے بچ سکے۔ لیکن مستثنیات کو چھوڑ کر ہم اپنے عام تعلیم یافتہ حضرات کو دماغی تربیت کے ان ابتدائی ثمرات سے بھی محروم پاتے ہیں۔ ان میں اتنی تمیز بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے اپنی صحیح حیثیت متعین کرلیں پھر اس حیثیت کے عقلی لوازم کو سمجھیں، اور ان کو ملحوظ رکھ کر ایسا طریقِ استدلال اختیار کریں جو اس حیثیت سے مناسبت رکھتا ہو۔ ان سے گفتگو کیجیے یا ان کی تحریریں دیکھیے۔ پہلی ہی نظر میں آپ کو محسوس ہوجائے گا کہ ان کے خیالات میں سخت الجھاؤ ہے۔ بحث کی ابتدا ایک حیثیت سے تھی، چند قدم چل کر حیثیت بدل دی، آگے بڑھے تو ایک دوسری حیثیت اختیار کرلی، اثباتِ مدعا کے لیے مقدمات کو سمجھ بوجھ کر انتخاب کرنا اور ان کو منطقی اسلوب پر مرتب کرنا تک نہ آیا۔ آغاز سے لے کر اختتام تک یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ دراصل آپ کا مدعا کیا ہے۔ کس مسئلے کی تحقیق پیشِ نظر تھی اور کیا آپ نے ثابت کیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کے اثر سے موجودہ تعلیم کا میلان زیادہ تر حسیات اور مادیات کی طرف ہے۔ وہ خواہشات کو تو بیدار کردیتی ہے، مطلوبات اور ضروریات کے احساس کو بھی ابھارتی ہے، محسوسات کی اہمیت بھی دلوں میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر عقل اور ذہن کی تربیت نہیں کرتی، تنقید اور تفکر کی صلاحیتوں کو نہیں چمکاتی، تہذیبِ نفس اور تنویرِ افکار سے غفلت برتتی ہے۔ اور سب سے زیادہ

یہ کہ مادّیات کی طرف غیر معتدل میلان پیدا کر کے ذہن کا توازن بگاڑ دیتی ہے، اس تعلیم سے مزین ہو کر جو لوگ نکلتے ہیں ان میں تعقل اور تفکر کا پندار تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور یہی پندار ان کو ہر چیز پر ''عقلی'' تنقید کرنے اور ہر اس چیز سے انکار کر دینے پر آمادہ کرتا ہے جو ان کی ''عقل'' میں نہ سمائے، مگر درحقیقت ان کا ذہن عقلیت سے منحرف ہوتا ہے اور صحیح عقلی طریق پر کسی مسئلے کو سلجھانے یا کسی امر میں رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔

اس غیر ''معقول عقلیت'' کا اظہار سب سے زیادہ ان مسائل میں ہوتا ہے جو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ یہی وہ مسائل ہیں جن کے روحانی و اخلاقی اور اجتماعی و عمرانی مبادی مغرب کے نظریات سے ہر ہر نقطہ پر متصادم ہوتے ہیں۔

آپ کسی انگریزی تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلے پر گفتگو کیجیے اور اس کی ذہنی کیفیت کا امتحان لینے کے لیے پہلے اس سے مسلمان ہونے کا اقرار کرا لیجیے، پھر اس کے سامنے مجرد حکم شریعت بیان کر کے سند پیش کیجیے۔ وہ فوراً اپنے شانے ہلائے گا اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہے گا کہ یہ ''ملائیت'' ہے، میرے سامنے عقلی دلیل لاؤ، اگر تمہارے پاس معقولات نہیں صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو تمہاری بات میں نہیں مان سکتا۔ بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری ہے۔ اس غریب کو برسوں کی تعلیم و تربیتِ علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلبِ حجت کے عقلی لوازم کیا ہیں اور طالب حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اسلام کی نسبت سے عقلاً انسان کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں، یا تو وہ مسلمان ہوگا۔ یا کافر ہوگا۔ اگر مسلمان ہے تو مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا اور رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر چکا ہے اور یہ بھی اقرار کر چکا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول جو حکم پہنچائے گا اس کی اطاعت بے چون و چرا کرے گا۔ اب فرداً فرداً ایک ایک حکم پر حجتِ عقلی طلب کرنے کا اسے حق ہی نہیں رہا۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کا کام صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ کوئی خاص حکم رسولِ خداؐ نے دیا ہے یا نہیں۔ جب حجتِ نقلی سے یہ حکم ثابت کر دیا گیا تو اس کو فوراً اطاعت کرنی چاہیے، وہ اطمینان قلب اور حصولِ بصیرت کے لیے حجتِ عقلی دریافت کر سکتا ہے، مگر اس وقت جب کہ وہ اطاعتِ حکم کے لیے سر جھکا چکا ہو، اطاعت کے لیے حجتِ نقلی کو شرط قرار دینا، اور حجت نہ ملنے یا اطمینانِ قلب نہ ہونے پر اطاعت سے انکار کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ

وہ دراصل رسولِ خدا کی حاکمیت (اتھارٹی) کا انکار کر رہا ہے اور یہ انکار مستلزم کفر ہے حالاں کہ ابتدا میں اس نے خود مسلم ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر وہ کافر کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے صحیح جائے قیام دائرۂ اسلام کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔ سب سے پہلے اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ جس مذہب پر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتا اس سے نکل جائے۔ اس کے بعد وہ اس لائق سمجھا جائے گا کہ حجتِ عقلی طلب کرے اور اس کی طلب کا جواب دیا جائے۔

یہ قاعدہ عقلِ سلیم کے مقتضیات میں سے ہے اور دنیا میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ کوئی حکومت ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی رعایا کا ہر فرد اس کے حکم پر حجتِ عقلی کا مطالبہ کرے اور حجت کے بغیر اطاعتِ امر سے انکار کر دے۔ کوئی فوج درحقیقت ایک فوج ہی نہیں بن سکتی اگر اس کا ہر سپاہی جنرل کے حکم کی وجہ دریافت کرے اور ہر معاملہ میں اپنے اطمینانِ قلب کو اطاعت کے لیے شرط قرار دے، کوئی مدرسہ کوئی کالج، کوئی انجمن غرض کوئی اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں بن سکتا کہ ہر ہر فرد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے، اور جب تک ایک ایک شخص کو اطمینان حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک کسی حکم کی اطاعت نہ کی جائے۔ انسان جس نظام میں داخل ہوتا ہے اس ابتدائی اور بنیادی مفروضہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ وہ اس نظام کے اقتدارِ اعلیٰ پر کلی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے۔ اب جس وقت تک وہ اس نظام کا جز ہے اس کا فرض ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کی اطاعت کرے خواہ کسی جزئی حکم پر اس کو اطمینان ہو یا نہ ہو۔ مجرمانہ حیثیت سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا امر دیگر ہے۔ ایک شخص جزئیات میں نافرمانی کر کے بھی ایک نظام میں شامل رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں بھی اپنے ذاتی اطمینان کو اطاعت کے لیے شرط قرار دیتا ہے تو دراصل وہ اقتدارِ اعلیٰ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور یہ صریح بغاوت ہے۔ حکومت میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا تو اس پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا جائے گا، فوج میں اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔ مدرسہ اور کالج میں فوری اخراج کی کارروائی کی جائے گی۔ مذہب میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوگا۔ اس لیے کہ اس نوع کے طلب حجت کا حق کسی نظام کے اندر رہ کر کسی شخص کو نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے طالب حجت کا صحیح مقام اندر نہیں، باہر ہے۔ پہلے وہ باہر نکل جائے پھر جو چاہے اعتراض کرے۔

اسلام کی تنظیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پہلے احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جتنی حجتیں ہیں سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ ہر عقلی دلیل اور فطری شہادت سے انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے واحد ہی اس کا الٰہ ہے، اور محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں۔ آپ جس قدر عقلی جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں اس بنیادی مسئلہ پر کر لیجیے۔ اگر کسی دلیل اور کسی حجت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو آپ کو داخل اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ احکامِ اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر جاری ہوگا۔ لیکن جب آپ نے اس کو قبول کر لیا تو آپ کی حیثیت ایک ''مسلم'' کی ہوگئی۔ اور مسلم کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجت پیش کی جائے اور احکام کی اطاعت کرنے کا انحصار آپ کے اطمینانِ قلب پر ہو۔ مسلم بن جانے کے بعد آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چون و چرا اس کی اطاعت میں سر جھکا دیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (النور:۵۱)

''ایمان لانے والوں کا کام صرف یہ ہے کہ جب اُن کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔''

ایمان اور ایسی طلبِ حجت جو تسلیم و اطاعت کے لیے شرط ہو، باہم متناقض ہیں اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔ جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالبِ حجت نہیں ہوسکتا، اور جو ایسا طالبِ حجت ہے وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب:۳۶)

''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کردے تو اُن کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔''

اسلام نے اصلاح اور تنظیم کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے وہ سب اسی قاعدہ کی وجہ

سے ہے۔ دلوں میں ایمان بٹھا دینے کے بعد جس چیز سے روکا گیا تمام اہل ایمان اس سے رک گئے اور جس چیز کا حکم دیا گیا وہ ایک اشارے پر لاکھوں کروڑوں انسانوں میں رائج ہوگئی۔ اگر ایک ایک چیز کے لیے عقلی حجتیں پیش کرنا ضروری ہوتا اور ہر امر و نہی کی حکمتیں اور مصلحتیں سمجھانے پر اطاعتِ احکام موقوف ہوتی تو قیامت تک انسانی اخلاق کی وہ اصلاح اور اعمال کی وہ تنظیم نہ ہو سکتی جو رسول اللہ ﷺ نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انجام دے دی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے احکام خلافِ عقل ہیں یا اس کا کوئی جزئی سے جزئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ اسلام اپنے پیروؤں سے اندھوں کی سی تقلید چاہتا ہے اور احکام کی عقلی و فطری بنیادوں کو تلاش کرنے اور ان کے مصالح و حکم کو سمجھنے سے روکتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی کے لیے تفقہ اور تدبر ضروری ہے۔ جو شخص احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو جتنا زیادہ سمجھے گا وہ اتنا ہی زیادہ صحیح اتباع کر سکے گا۔ ایسے فہم اور ایسی بصیرت سے اسلام روکتا نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن زمین و آسمان کا فرق ہے، اس عقلی تجسس میں جو اطاعت کے بعد ہو، اور اس عقلی امتحان میں جو اطاعت سے پہلے اور اطاعت کے لیے شرط ہو۔ مسلم سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کرتا ہے۔ پھر احکام کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی مصلحت اس کی سمجھ میں آجائے اس کو تو دراصل خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر اطمینانِ کلی حاصل ہے۔ اس کے بعد وہ بصیرتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے جزئیات پر مزید اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر یہ اطمینان بھی حاصل ہو جائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو اس اطمینانِ کلی کی بنا پر جو اُسے خدا اور رسول پر ہے، بلا تامل احکام کی اطاعت کیے چلا جاتا ہے۔ اس قسم کی طلبِ حجت کو اس طلبِ حجت سے کیا نسبت جو ہر قدم پر پیش کی جائے اور اس داعیہ کے ساتھ پیش کی جائے کہ اگر اطمینان کرتے ہو تو قدم اٹھاتا ہوں، ورنہ پیچھے پلٹا جاتا ہوں۔

حال میں ایک تحریر ہماری نظر سے گزری جو ایک مسلم جماعت کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ جماعت اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مذہب سے منحرف بھی نہیں۔ بلکہ اپنی دانست میں بڑی مذہبی خدمت انجام دے رہی ہے، مذہبی ''اصلاح'' کے نام سے جن امور کی تبلیغ وہ کرتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر سال بقرعید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے روکا

جاتا ہے اور انھیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو روپیہ جانوروں کو ذبح کرنے پر صرف کرتے ہیں اسے قومی ادارات کی اعانت، یتیموں اور بیواؤں کی پرورش اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے میں صرف کریں۔ اس تبلیغ پر کسی مسلمان نے اعتراض کیا، جس کی پوری عبارت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ مگر اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے:

> ’’سوائے نقل وتقلید کے آج تک کسی صاحب نے قربانی کے عقلی وتجربی فوائد پر روشنی نہیں ڈالی... اگر کوئی صاحب اس سے پہلے کہ ہم کو اپنے عقیدۂ قربانی کے عقلی پہلو سے آگاہ فرمائیں تو ہمارے شکریہ کے مستحق ہوں گے۔‘‘

یہ تحریر نمونہ ہے ان لوگوں کی دماغی حالت کا جو اپنے آپ کو ’’تعلیم یافتہ‘‘ کہتے ہیں۔ ایک طرف ’’عقلیت‘‘ کا اس قدر زبردست دعویٰ ہے اور دوسری طرف ’’غیر عقلیت‘‘ کا ایسا شدید مظاہرہ ہے۔ صرف یہی دو فقرے جو قلم مبارک سے نکلے ہیں اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ آپ نے اپنی صحیح حیثیت ہی متعین نہیں کی۔ اگر آپ مسلم کی حیثیت سے بول رہے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے ’’نقل‘‘ کے آگے سر جھکانا چاہیے پھر عقلی حجت کا مطالبہ کرنے کا حق آپ کو ہوگا، اور وہ بھی شرطِ اطاعت کے طور پر نہیں بلکہ محض اطمینان قلب کے لیے۔ اور اگر آپ اطاعت سے پہلے حجتِ عقلی کے طالب ہیں اور یہ شرطِ اطاعت ہے، تو آپ کو ’’مسلم‘‘ کی حیثیت سے بولنے کا حق نہیں۔ اس نوع کے طالبِ حجت کو پہلے ایک غیر مسلم کی حیثیت اختیار کرنی چاہیے پھر اس کو یہ حق تو حاصل ہوگا کہ مسئلے پر چاہے اعتراض کرے، مگر یہ حق نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے کسی امرِ دینی میں مفتیِ اسلام بن کر فتویٰ صادر کرے، آپ ایک ہی وقت میں ان دونوں متضاد حیثیتوں کو اختیار کرتے ہیں اور ایک حیثیت کے بھی عقلی لوازم پورے نہیں کرتے، ایک طرف آپ نہ صرف ’’مسلم‘‘ بلکہ مفتیِ اسلام بنتے ہیں دوسری طرف آپ کا یہ حال ہے کہ ’’نقل‘‘ کو آپ ہیچ سمجھتے ہیں۔ حکم کا ’’حکم‘‘ ہونا آپ کو نقل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاتا ہے تو آپ اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ پہلے اس حکم کے عقلی وتجربی فوائد پر روشنی ڈالی جائے۔ بالفاظِ دیگر آپ کسی حکم کو محض حکمِ خدا اور رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں مانیں گے بلکہ اس کے عقلی وتجربی فوائد کی بنا پر مانیں گے اگر ایسے فوائد معلوم نہ ہو سکیں یا آپ کے معیار پر وہ فوائد ثابت نہ ہوں تو آپ حکم کو رد کر دیں گے، اس کے خلاف پروپیگنڈہ کریں گے، اس کو

’’بے محل‘‘، ’’بے معنی‘‘، ’’فضول‘‘ بلکہ مضر اور ’’مسرفانہ‘‘، ’’رسم‘‘ قرار دیں گے اور مسلمانوں کو اس کے اتباع سے روکنے میں اپنی پوری قوت صرف کریں گے۔ کون سی عقل ہے جو اس متناقض طرزِ عمل اور متضاد حیثیات کے اختلاط کو جائز رکھتی ہے؟ حجت عقلی کا مطالبہ بجا و درست ہے۔ مگر پہلے یہ ثابت کیجیے کہ آپ ذوی العقول میں سے ہیں۔

’’عقلی‘‘ اور ’’تجربی‘‘ فائدہ کسی ایک مخصوص اور معین چیز کا نام نہیں ہے، یہ ایک نسبتی و اضافی چیز ہے۔ ایک شخص کی عقل ایک چیز کو مفید سمجھتی ہے، دوسرے کی عقل اس کے خلاف حکم لگاتی ہے۔ تیسرا شخص اس میں کسی نوع کا فائدہ تسلیم کرتا ہے مگر اس کو اہمیت نہیں دیتا اور ایک دوسری چیز کو اس سے زیادہ مفید ٹھہراتا ہے۔ تجربی فوائد میں اس سے بھی زیادہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ فائدے کے متعلق ہر شخص کا نظریہ الگ ہے اور اسی نظریہ کے لحاظ سے وہ اپنے یا دوسروں کے تجربات کو مرتب کر کے مفید یا غیر مفید ہونے کا حکم لگاتا ہے۔ ایک شخص نفع عاجل کا طالب ہے اور صرف ضررِ عاجل کو قابلِ عذر سمجھتا ہے، اس کا انتخاب ایسے شخص کے انتخاب سے یقیناً مختلف ہوگا جس کی نظر مآلِ کار پر ہو۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ایک نوع کا فائدہ اور دوسری نوع کی مضرت ہے۔ ایک ان کو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ وہ فائدہ کی خاطر مضرت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسرا شخص ان سے اجتناب کرتا ہے کیونکہ اس کی رائے میں ان کی مضرت ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ پھر عقلی اور تجربی فوائد میں بھی بسا اوقات تخالف پایا جاتا ہے۔ ایک چیز تجربی حیثیت سے مضر ہے مگر عقل فیصلہ کرتی ہے کہ کسی بڑے عقلی فائدے کے لیے اس مضرت کو برداشت کرنا چاہیے۔ ایک دوسری چیز ہے جو تجربی حیثیت سے مفید ہے مگر عقل یہ فتویٰ دیتی ہے کہ کسی عقلی مضرت سے بچنے کے لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایسے اختلافات کی موجودگی میں کسی چیز کے ’’عقلی‘‘ اور ’’تجربی‘‘ فوائد پر کوئی ایسی روشنی ڈالنی ممکن ہی نہیں جس سے تمام لوگ اس کے مفید ہونے پر متفق ہو جائیں اور انکار کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ محض ایک قربانی پر کیا موقوف ہے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور اوامر و نواہی شریعت میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کے عقلی وتجربی فوائد پر ایسی روشنی ڈال دی گئی ہو کہ وہ کالشمس فی النہار نظر آنے لگے ہوں اور تمام لوگوں نے ان کو ایسا تسلیم کر کے ان کی پابندی اختیار کر لی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ایک شخص بھی دنیا میں تارکِ صوم وصلوٰۃ اور منکرِ حج وزکوٰۃ نہ ہوتا۔ اسی لیے اسلام نے احکام کو ہر شخص

کی عقل اور تجربہ کے فتوے پر موقوف نہیں رکھا ہے بلکہ ایمان اور اطاعت کو اساس بنایا ہے۔ مسلم، عقلی اور تجربی فوائد پر ایمان نہیں لاتا بلکہ خدا اور رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس کا مذہب یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کا فائدہ عقل و تجربہ سے ثابت ہو جائے تب وہ اس کو قبول کرے، اور کسی کی مضرت عقلی و تجربی حیثیت سے مبرہن ہو جائے تب وہ اس سے اجتناب کرے بلکہ اس کا مذہب یہ ہے کہ جو حکم خدا اور رسول سے ثابت ہو جائے وہ قابلِ اتباع ہے اور جو ثابت نہ ہو وہ قابلِ اتباع نہیں۔

پس یہاں اصلی سوال یہی ہے کہ آپ کا ایمان عقل اور تجربہ پر ہے یا خدا اور اس کے رسول پر؟ اگر پہلی بات ہے تو آپ کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ پھر آپ کو مسلمان بن کر گفتگو کرنے اور مسلمانوں کو ''ارضِ غیر ذی ذرع کی نام نہاد سنت'' سے اجتناب کا مشورہ دینے کا کیا حق ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو مدارِ بحث عقلی و تجربی فوائد نہ ہونے چاہئیں بلکہ یہ سوال ہونا چاہیے کہ آیا قربانی محض ایک رسم ہے، جس کو مسلمانوں نے گھڑ لیا ہے یا ایک عبادت ہے جس کو اللہ نے پسند فرمایا ہے اور اللہ کے رسول نے اپنی امت میں جاری کیا؟

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۵۵ھ، جون ۱۹۳۶)

تجدّد کا پائے چوبیں

ماہ جون ۱۹۳۳ء کے نگار میں حضرت نیاز فتح پوری نے ''ترجمان القرآن'' پر ایک مفصل تبصرہ فرمایا ہے، جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ اگرچہ عموماً رسائل و جرائد کے انتقادات پر بحث کرنے اور ان پر جوابی نقد کرنے کا دستور نہیں ہے، لیکن چوں کہ ناقدِ فاضل نے اپنے تبصرہ میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو اُن کے مذہبِ تجدد کے مخصوص اصول و مبادی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی اصلاح کرنا ''ترجمان القرآن'' کے اولین مقاصد میں سے ہے، اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان پر اظہار خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالبِ قرآن اور تعلیماتِ فرقانی کو اُن کی صحیح روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا، یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن جیسا کہ خود فاضل ایڈیٹر صاحب نے ظاہر کیا ہے۔ عہدِ حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں۔ عہدِ ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا، کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا۔ لیکن اب جب کہ علوم جدیدہ اور اکتشافاتِ حاضرہ نے ''عمل و خیال'' کی بالکل نئی طرح ڈال کر ''حریت فکر و ضمیر'' کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے، مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا طرزِ عمل بھی یہی تھا، اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جو اب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محلِ نظر بتایا جاتا ہے۔ اگر پہلے رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب

"علوم مقناطیسیہ" انہی معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لیے آمادہ ہیں، پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر عرش و کرسی والے خدا کو پکار سکتا تھا، لیکن آج جب کہ آسمان ہی کوئی چیز نہ رہا، اس کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ "یومنون بالغیب" کا نہیں رہا، بلکہ "یومنون بالتجربۃ والشہود" کا ہے۔ اور ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں، جب کہ خود نفس مذہب کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابل قبول نہیں۔"

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:

"قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے، ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کیے گئے ہیں۔ اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے۔ حصہ اول کے متعلق نہ زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں۔ البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حالیہ نے انہی دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔"

"اس کے لیے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کر کے تمام ان قرآنی آیات کا استقصاء کرنا چاہیے جو عقائد و قصص کے متعلق ہیں اور اُن کا صحیح مفہوم و مدعا متعین کر کے ان اعتراضات کو رفع کرنا چاہیے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کیے جاتے ہیں۔"

آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"آئندہ کے لیے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی والہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے۔ اور مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت و لامذہبیت کا ہے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الٰہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں، اس کے بعد میں اپنے شبہات و

اعتراضات پیش کروں گا اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہو گئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ "ناچار مسلمان شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، ان کا ایک بڑا سبب عقیدۂ معاد بھی ہے۔"

فاضل مبصر نے جن فروعی و جزئی مسائل کی طرف اشارے کیے ہیں اُن کو چھوڑ کر میں صرف اُن اُمور سے بحث کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق اصول سے ہے۔

انھوں نے قرآنِ مجید کے مباحث کی تقسیم تین حصوں پر کی ہے۔ لیکن ہم بآسانی ان کو صرف دو حصوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے علم کی حدود سے باہر ہیں۔ ہمارے ادراک کی سرحد سے ماوراء ہیں جن کے متعلق قطعیت کے ساتھ صحیح یا غلط ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے اور جن میں قرآن ہم کو ایمان بالغیب لانے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسرے وہ امور جو ہمارے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہیں، اور جن میں قطعیت کے ساتھ کوئی حکم عقلی لگانا ہمارے لیے ممکن ہے۔ پہلے حصے میں وجود وصفاتِ الٰہی، فرشتے، وحی و کتبِ آسمانی، حقیقتِ نبوت، بعث بعد الموت، عذاب و ثواب آخرت، اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے علاوہ وہ تمام ماورائے سرحدِ علم و ادراک باتیں بھی آجاتی ہیں جو قصص اور تمثیلات کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ عام اس سے کہ وہ بالذات عام انسانی ادراک کی سرحد سے ماوراء ہوں، یا اس بنا پر ایسی ہوں کہ سر دست ہم جس مرتبۂ عقلی و علمی میں ہیں اس میں ہم اُن کی صحت و صداقت کے متعلق کوئی حکم لگانے کے قابل نہیں ہیں، دوسرے حصہ میں وہ تمام امور آجاتے ہیں جن کا تعلق اسلام کی تعلیم حکمت وتزکیۂ نفوس اور تنظیم حیاتِ انسانی کے اصول سے ہے۔

ناقد فاضل کی رائے میں دوسرے حصے سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ اس بارے میں جیسے اور مذاہب ہیں ویسا ہی اسلام بھی ہے۔ البتہ بحث صرف پہلے حصے سے کی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ لوگوں میں ریب و تذبذب کی کیفیت انہی امور کے بارے میں پیدا ہوگئی ہے جو اس حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر یہ سوال کہ ان امور کے متعلق ریب و تذبذب کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں تو قدامت پرستی اور جہالت کی وجہ سے لوگ غیب کی باتوں پر ایمان لے آتے تھے، لیکن اب علومِ جدیدہ اور اکتشافاتِ حاضرہ نے عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریتِ فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے، اس لیے

اب ''یومنون بالغیب'' کا زمانہ نہیں رہا بلکہ یومنون بالتجربۃ والشھود'' کا زمانہ ہے۔

اس رائے کی بنیاد چند غلطیوں پر ہے جن میں پہلی غلطی گزشتہ اور موجودہ زمانہ کے حقیقی فرق کو نہ سمجھنا ہے، بدقسمتی سے تنہا حضرت نیاز ہی نہیں بلکہ بہت بڑا گروہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مذہب کی شمع صرف گزشتہ زمانے کی تاریکی ہی میں جل سکتی تھی۔ علوم جدیدہ کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد اس کا روشن ہونا مشکل ہے۔ حالانکہ علوم عقلیہ جن کو یہ لوگ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں کچھ اس زمانہ کی مخصوص متاع نہیں ہیں۔ گزشتہ زمانے میں بھی ان علوم کی روشنی نے آنکھوں کو اسی طرح خیرہ کیا ہے اور گزشتہ زمانے میں بھی جن لوگوں کی آنکھیں ان سے خیرہ ہوئی ہیں، انھوں نے یہی سمجھا ہے کہ مذہب کی شمع اب روشن نہیں رہ سکتی۔ جو علوم اس زمانے کے ''علوم جدیدہ'' اور جو انکشافات اس زمانے کے ''انکشافات حاضرہ'' تھے، وہ اُن کے زعم میں عمل وخیال کی بالکل نئی طرح ڈال چکے تھے اور انھوں نے دماغوں کو حریت فکر وضمیر کی دولت سے ایسا مالا مال کیا تھا کہ اُن کے روشن زمانہ میں ''یومنون بالغیب'' کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کیا بالکل یہی حالت دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی تک نہیں گزری ہے، افلاطون، ارسطو، اپیکورس، زینو، برقلس، اسکندر، فردوسی، فلاطینوس اور دوسرے علمائے فلسفہ وحکمت کے خیالات جب اسلامی ممالک میں شائع ہوئے اور ان کی بدولت فلسفیانہ تفکر اور عقلی اجتہاد کا ایک نیا دور شروع ہوا تو کیا اس وقت بھی ایک گروہ نے بالکل یہی نہ سمجھا تھا جو اب ایک گروہ سمجھ رہا ہے؟ کیا اس زمانہ کی ''حریت فکر وضمیر'' اور ''عمل وخیال کی نئی طرح'' نے اس طرح لوگوں کو مذہبی معتقدات کی طرف سے ریب وشک میں نہ ڈال دیا تھا؟ مگر پھر کیا ہوا؟ فلاسفہ کے وہ بہت سے نظری وقیاسی مسائل جن پر اس وقت کے لوگ ایمان لے آئے تھے، بعد میں غلط ثابت ہوئے۔ وہ آفتاب علم جس کے سامنے اُن لوگوں کو مذہب کی شمع ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی زمانہ کی ایک ہی گردش میں بے نور ہو کر رہ گیا۔ ان کے ''علوم جدیدہ'' فرسودہ ہو گئے، ان کے ''انکشافات حاضرہ'' میں عمل وخیال کی نئی طرحیں ڈالنے کی قوت باقی نہ رہی اور جو طرحیں انھوں نے ڈالی تھیں وہ سب پرانی ہو گئیں۔ حتیٰ کہ اپنے زمانہ کے انکشافات پر کامل یقین واذعان رکھتے ہوئے انھوں نے جو عقلی استدلالات کیے تھے اور ان پر جن مذاہب حکمت کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے اکثر کو آج ایک معمولی طالب علم بھی لغو ومہمل قرار دینے میں تامل نہیں کرتا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ گزشتہ زمانہ کی تاریکی میں ہی مذہب کی شمع جل سکتی تھی مگر اب اس روشنی کے زمانہ میں نہیں جل سکتی، تو ہمیں بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ جن چیزوں کو آج علوم جدیدہ وانکشافات حاضرہ کہہ کر وہی دعوے کیے جا رہے ہیں جو پہلے کیے گئے تھے، ان کے متعلق بھی ہم کو یقین ہے کہ اُن میں بیشتر کا وہی حشر ہونا ہے جو گزشتہ لوگوں کے ''علوم جدیدہ'' اور ''انکشافات حاضرہ'' کا ہو چکا ہے اور ''عمل وخیال کی نئی طرحیں'' بھی زمانہ کی گردش کے ساتھ پرانی اور فرسودہ ہو جانے والی ہیں۔ آپ ان تمام علوم و انکشافات پر ایک غائر نظر ڈالیے جو آپ کا سرمایہ فخر وناز ہیں اور خود ان لوگوں سے جو علوم و انکشافات کے اصلی محقق اور ملتفت ہیں دریافت کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ علوم کی طرح ان میں بھی ایسی یقینیات بہت کم ہیں، جن کے متعلق اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہو کہ اُن کے غلط ثابت ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ باقی جتنی چیزیں ہیں سب ظنون، قیاسات، نظریات، ارتیابات اور تذبذبات ہیں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کی جانب زمانہ کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا جائے گا'' یہ علوم جدیدہ'' اور ''انکشافات حاضرہ'' قدامت کا لباس عار پہنتے جائیں گے اور عمل وخیال کی نئی طرحیں جو ان ناپائیدار علوم وانکشافات کے بھروسہ پر پڑی ہیں، کچھ دوسری نئی طرحوں کے لیے جگہ خالی کرتی جائیں گی۔

پس جب حال یہ ہے تو ایک ہوش مند اور بالغ النظر آدمی کے لیے اس خیال سے ہیبت زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب ''علوم جدیدہ'' اور ''انکشافات حاضرہ'' نے ''عمل وخیال کی نئی طرحیں ڈال دی ہیں'' اور ''حریت فکر وضمیر'' کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے۔ لہٰذا اب خدا جانے مذہب کا کیا حشر ہو۔ وہ تو ان علوم وانکشافات پر ایک تحقیقی نظر ڈال کر یہ دیکھے گا کہ ان میں جو چیزیں مذہب سے متصادم ہو رہی ہیں وہ یقینی بھی ہیں یا نہیں۔ اگر فی الواقع وہ یقینیات ہوں اور مذہب کے حقیقی معتقدات سے متصادم بھی ہوں تو بلاشبہ اس کے لیے یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ مذہب پر ایمان لائے یا ان یقینی نتائج تحقیق پر؟ لیکن اگر وہ محض قیاسات و نظریات ہوں یا محض شک اور تذبذب میں ڈالنے والی چیزیں ہوں تو وہ اُن کے اور مذہب کے تصادم سے ہرگز نہ گھبرائے گا کیوں کہ مذہب کی بنیاد اگر یقین واذعان پر ہے تو یقین واذعان کے مقابلہ میں ظن وقیاس اور شک وتذبذب کو ہرگز کوئی ترجیح حاصل نہیں۔ اور اگر مذہب کوئی

ظنی و قیاسی چیز ہے تو اسی ظن و قیاس پر تو جدید علمی نظریات کی بنیاد بھی ہے۔ پھر دونوں میں وجہ ترجیح کیا چیز ہے؟

علومِ جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ سے مرعوب ہو کر مذہب کی طرف ایک ترمیم طلب نگاہ ڈالنا تو صرف اُن لوگوں کا شیوہ ہے جن کے دل میں یہ تخیل گھر کر گیا ہے کہ ہر نئی چیز علم و اکتشاف ہے اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے اس کو قبول کر لینا یا اس پر ایمان لے آنا ضروری ہے، خواہ اس کی حیثیت محض دقیانوسی و نظری ہو اور خواہ اس کو انھوں نے گہری علمی بصیرت کے ساتھ نقدِ صحیح کی کسوٹی پر پرکھا بھی، ایسے ہی لوگوں میں ’’عمل و خیال کی نئی طرحیں‘‘ ڈالنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ عمل و خیال کی نئی طرحیں کیوں کر پڑتی ہیں اور کون سی طرحیں عاقلانہ ہوتی ہیں اور کون سی محض طفلانہ۔ اسی طرح ’’حریتِ فکر و ضمیر کی دولت سے مالا مال‘‘ ہونے کا ادعا بھی ایسے ہی سطحی النظر لوگوں کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے مگر انھیں معلوم نہیں کہ مجرد حریتِ فکر و ضمیر ایک فتنہ اور ایک خطرناک حالت ہے اگر اس کے ساتھ ایک وسیع اور پختہ علم، ایک عمیق اور بالغ نظر، ایک متوازن اور صحیح الفکر دماغ نہ ہو اور یہ وہ چیز ہے جس کو عطا کرنے میں قدرت نے اتنی فیاضی سے کام نہیں لیا جتنی آج کل فرض کر لی گئی ہے۔

دوسرا نظریہ جو اسی پہلے نظریہ سے نکلا ہے، یہ ہے کہ اب زمانہ ’’یومنون بالغیب‘‘ کا نہیں رہا بلکہ ’’یومنون بالتجربۃ والشھود‘‘ کا ہے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکا کہ ان الفاظ کے قائل کا حقیقی مقصود کیا ہے، اگر مقصود یہ ہے کہ زمانہ میں کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی جاتی جس پر غیب کا اطلاق ہوتا ہو اور جس کا تجربہ یا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو تو یہ بالکل غلط ہے۔ ایسا کہنے کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوگا کہ اس زمانہ میں لوگوں نے صرف اسی حد کے اندر محدود رہنا قبول کر لیا ہے جس میں ان کا تجربہ و مشاہدہ ان کے لیے وسیلۂ اکتسابِ علم بن سکتا ہے اور جس میں ان کے حواس کام دے سکتے ہیں اور اس دائرے کے باہر جتنے امور ہیں ان کے بارے میں فکر کرنا اور قیاس و استقراء سے ان کے متعلق حکم لگانا انسان نے چھوڑ دیا ہے۔ مگر کوئی شخص جس نے ’’علومِ جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ‘‘ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، اس بیان کو تسلیم نہ کرے گا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کو چھوڑیے جس کی بحث تمام تر امورِ غیب سے ہے۔ خود سائنس اور اس کے امورِ طبیعیہ کو لے لیجیے جن کے اعتماد پر آپ ’’ایمان بالتجربۃ والشھود‘‘ کا اعلان کر رہے ہیں۔

اس فن کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس کی تحقیقات کا مدار قوت، انرجی، قانون، فطرت، مادّہ، رشتہ، علت و معلول اور ایسے ہی دوسرے امور کے اقرار و اثبات پر نہیں؟ کون سا عالمِ طبیعیات ایسا ہے جو ان چیزوں پر ایمان نہیں رکھتا؟ کسی بڑے سے بڑے حکیم سے جا کر پوچھیے کہ ان میں سے کس کی حقیقت وہ جانتا ہے؟ کس کی کہنہ تک اس کے حواس کے جواز پہنچ سکے ہیں؟ کس کے نفسِ وجود کا تجربہ و مشاہدہ اس نے کر لیا ہے؟ اور کس کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت وہ پیش کر سکتا ہے؟ پھر یہ غیب پر ایمان نہیں تو اور کیا ہے؟

ان الفاظ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی بات مانی جاتی ہے جس کا تمام انسانوں نے تجربہ و مشاہدہ کیا ہے اور جو نوعِ انسانی کے تمام افراد کے لیے شہود و حضور کا مرتبہ رکھتی ہے، لیکن یہ ایسی بات ہے جو کسی مردِ عاقل کی زبان سے نہیں نکل سکتی اس لیے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ تمام انسانی معلومات افرادِ انسانی کو فرداً فرداً حاصل نہیں ہیں، بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں مخصوص جماعتوں اور مخصوص افراد کو اختصاص کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ ان خصوصی معلومات کا ہر شعبہ صرف اپنے مختص عالموں کے لیے حاضر اور باقی تمام انسانوں کے لیے غائب ہوتا ہے اور جمہور کو اس شخص یا اس گروہ پر ایمان بالغیب لانا پڑتا ہے، جو اس شعبہ کا عالم ہو۔

تیسرا مفہوم اس قضیۂ کلیہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کا ہر شخص صرف وہی بات مانتا ہے جو اس کے ذاتی تجربے یا مشاہدے میں آئی ہو، اور ایسی کسی بات کو نہیں مانتا جو خود اس کے لیے غیب کا حکم رکھتی ہو۔ لیکن یہ ایسی بات ہے کہ اس سے زیادہ مہمل کوئی بات انسانی دماغ سے نہیں نکل سکتی۔ اس صفت کا نہ کوئی آدمی کبھی پایا گیا ہے نہ آج پایا جاتا ہے، نہ قیامت تک اس کے پائے جانے کی امید ہے۔ اور اگر فی الواقع کہیں موجود ہے تو اس کی نشان دہی کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہیے، کیوں کہ ’’اکتشافاتِ حاضرہ‘‘ میں یہ اکتشاف سب سے زیادہ اہم ہوگا۔

غرض آپ خواہ کسی پہلو سے اس فقرہ کو دیکھیں اس میں کوئی صداقت آپ کو نظر نہ آئے گی۔ خود تجربہ و مشاہدہ ہی اس پر گواہ ہے کہ یہ زمانہ بھی اسی طرح یومنون بالغیب کا ہے جس طرح گزشتہ زمانہ تھا اور ایمان بالغیب جس چیز کا نام ہے اس سے انسان کو نہ کبھی چھٹکارا ملا ہے نہ مل سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے ۹۹۹ فی ہزار بلکہ اس سے زیادہ معاملات میں ایمان بالغیب

لاتا ہے اور لانے پر مجبور ہے۔ اگر وہ یہ عہد کر لے کہ صرف اپنے تجربہ و مشاہدہ پر ہی ایمان لائے گا تو اس کو معلومات کا وہ تمام ذخیرہ اپنے دماغ سے خارج کر دینا پڑے گا جسے دوسروں پر اعتماد کر کے اس نے مقامِ علم و یقین میں جگہ دی ہے، اکتسابِ علم کے ان تمام ذرائع کا مقاطعہ کر دینا پڑے گا جو خود اس کے اپنے تجربہ و مشاہدہ سے ماسواء ہیں، اور یہ ایسی حالت ہوگی جس میں وہ زندہ ہی نہ رہ سکے گا، کجا کہ دنیا کا کوئی کام کر سکے۔ پس ایمان بالغیب کی کلی نفی اور ایمان بالتجربہ والشہود کا کلی اثبات نہ اس زمانہ میں ممکن ہے اور نہ اس سے بھی زیادہ روشن کسی اور زمانہ میں ہونے کی توقع ہے۔ لامحالہ ہر زمانے اور ہر حالت میں انسان مجبور ہے کہ اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے بغیر بہت سی باتیں محض دوسروں کے اعتماد پر مان لے۔ کچھ باتیں اس کو خبر متواتر کی بنا پر ماننا پڑتی ہیں، جیسے یہ کہ سنکھیا کھانے سے آدمی مرجاتا ہے، درانحالیکہ ہر شخص نے نہ خود سنکھیا کھا کر اس کا تجربہ کیا نہ کسی کو کھا کر مرتے ہوئے دیکھا۔ کچھ باتوں کو ایک یا چند معتبر آدمیوں کی روایت سے مان لینا پڑتا ہے، جیسے عدالتوں کا شہادت پر اعتماد، کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو قانون کی مشین ایک لمحہ کے لیے بھی حرکت نہ کر سکے۔ کچھ باتیں صرف اس بنا پر تسلیم کر لینی پڑتی ہیں کہ ان کو ایک ماہرِ فن کہہ رہا ہے۔ یہ حالت ہر مدرسہ اور ہر کالج میں ہر طالب علم پر گزرتی ہے۔ اگر وہ اپنے فن کے اکابر علماء و ماہرین کی تحقیقات اور اُن کے اکتشافات و نظریات پر ایمان بالغیب نہ لائے تو علم کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور نہ کبھی ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں وہ خود ان علماء و ماہرین کی طرح حقائقِ علمیہ کی تحقیق کرنے کے قابل ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہم ان تمام معاملات میں دوسروں پر ایمان بالغیب لاتے ہیں اور لانے پر مجبور ہیں جن میں ہم نے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے اکتسابِ علم نہیں کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے کہ کس معاملہ میں کس پر ایمان بالغیب لانا چاہیے؟ اصولاً یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ایسے ہر معاملہ میں صرف اس شخص یا جماعت پر ایمان لانا چاہیے جس کے متعلق ہم کو یہ اطمینان ہو کہ اُسے اس معاملہ کا بہتر علم حاصل ہے اور اس کے پاس اس کے جاننے کے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ اسی قاعدۂ کلیہ کے ماتحت ایک مریض ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل سے مشورہ نہیں کرتا، اور ایک اہلِ مقدمہ وکیل کو چھوڑ کر انجینئر کے پاس نہیں جاتا۔ لیکن الٰہیات و روحانیات کے مسائل میں یہ اختلاف واقع ہوتا

ہے کہ آیا ان میں علمائے فلسفہ و ماہرین علومِ عقلیہ کی رائے تسلیم کی جائے یا عالمِ انسانی کے مذہبی و روحانی پیشواؤں کی؟ خدا اور ملائکہ، وحی والہام، روح اور حیات بعد الموت، عذاب و ثوابِ آخرت اور ایسے ہی دوسرے امورِ غیب میں کانٹ اور اسپنسر، آئین اسٹائین اور برگسان جیسے لوگوں کی بات مانی جائے، یا ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام جیسے بزرگوں کی؟ ''حریتِ فکر و ضمیر'' کے مدعیوں کا رجحان پہلے گروہ کی جانب ہے اور انہی کی مہیا کی ہوئی کسوٹی پر گروہِ انبیاء کی باتوں کو کس کر دیکھتے ہیں۔ جو باتیں اس کسوٹی پر کھری نکلتی ہیں انھیں مان لیتے ہیں، اس لیے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے کہی ہیں، بلکہ اس لیے کہ حکماء و فلاسفہ نے ان کو شرفِ قبول عطا کیا ہے (اور بد قسمتی سے ایسی باتیں بہت ہی کم بلکہ بالکل نہیں ہیں) اور جو باتیں اس کسوٹی پر کھوٹی نکلتی ہیں اُن کو وہ غیر معتبر قرار دے کر رَد کر دیتے ہیں۔ برعکس اس کے ''قدامت پرستوں اور اسلاف پرستوں'' کا مسلک یہ ہے کہ نہ طبعیات و عقلیات کی باتیں الٰہیات و روحانیات والوں سے پوچھو اور نہ اس کے برعکس الٰہیات و روحانیات کی باتیں، عقلیات و طبعیات والوں سے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں اور ایک علم میں دوسرے علم کے ماہر کی رائے دریافت کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ حکماء و فلاسفہ اپنے عقلی علوم میں خواہ کتنی ہی اعلیٰ بصیرت رکھتے ہوں لیکن علومِ الٰہیہ میں ان کا مرتبہ ایک عامی سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اُن کے متعلق معلومات کے اتنے ہی ذرائع رکھتے ہیں جتنے ہر معمولی انسان رکھتا ہے۔ یہ علوم مخصوص ہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ وہی ان کے ماہر ہیں اور انہی کے پاس ان کے اصلی ذرائع ہیں۔ اس لیے اُن کے مسائل میں انہی پر ایمان بالغیب لانا چاہیے۔ آپ کے لیے بحث و کلام کی اگر گنجائش ہے تو وہ صرف اس امر میں ہے کہ آیا فی الواقع وہ سچے اور علومِ الٰہیہ میں صاحبِ بصیرتِ تامہ ہیں یا نہیں۔ مگر جب یہ بات ثابت ہو جائے یا ثابت کر دی جائے کہ فی الحقیقت وہ ایسے ہیں تو پھر جو باتیں اپنی بصیرت اور اپنے علم کی بنا پر انھوں نے بیان کی ہیں وہ سب آپ کو ماننی پڑیں گی۔ ان سے انکار کرنا اور ان کے خلاف دلیل و حجت لانا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک اندھا سورج کے وجود سے انکار کر دے اور آنکھوں والوں کو جھٹلانے کے لیے وجودِ شمس کے امتناع پر دلیلیں پیش کرے۔ ایسا شخص اپنے زعم میں خواہ کتنا ہی بڑا فلسفی ہو مگر جو اپنی آنکھوں سے سورج کو دیکھ رہا ہے وہ اس نابینا کے متعلق جو کچھ رائے قائم کرے گا اس کے بیان کی حاجت نہیں۔

آپ کہیں گے کہ انبیاء علیہم السلام نے امورِ غیب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی تائید "علومِ جدیدہ" و "اکتشافاتِ حاضرہ" سے نہیں ہوتی، اس لیے لوگ "ریب وتذبذب" میں مبتلا اور "ناچار مسلمان شو" کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ مگر میں کہوں گا کہ ان علوم و اکتشافات میں وہ کون سے یقینیات ہیں جو اصولِ اسلام سے ٹکراتے ہیں؟ اگر ہیں تو انھیں پیش فرمایئے تا کہ ہم بھی غور کریں کہ آیا قرآن کو مانیں یا علومِ جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ کو۔ اور اگر نہیں ہیں اور ہرگز نہیں ہیں، جیسا کہ خود آپ کے الفاظ "ریب وتذبذب" اور "ناچار مسلمان شو" سے ظاہر ہوتا ہے۔ تو پھر کیا علومِ جدیدہ و اکتشافاتِ حاضرہ کے اسلحہ خانے میں صرف ظنیات و قیاسات ہی کے وہ ہتھیار ہیں جن کے بل پر وہ مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ دے رہے ہیں اور جن کی کاٹ نہیں۔ محض چمک دمک دیکھ کر آج کل کے اربابِ "حریتِ فکر و ضمیر" یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مذہب ان کا نام سنتے ہی سہم جائے گا۔ اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا؟ آپ ان علوم و اکتشافات کو خواہ کتنی ہی اہمیت دیں مگر یاد رکھیے کہ امورِ غیب میں وہ ہرگز مفید یقین نہیں ہیں زیادہ سے زیادہ ان کا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ آپ "ریب وتذبذب" میں پڑ جائیں اور کہیں کہ ہم وحی و الہام، بعث بعد الموت، عذاب و ثواب آخرت، فرشتوں کے وجود اور خود خدا کے وجود کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کو "ناچار مسلمان شو" کی لعنت سے نکالنے اور "کافر تواں شد" کی برکت سے مالا مال ہونے میں یہ علوم کچھ بھی مدد دے سکیں۔ کیوں کہ امورِ مذکورہ بالا سے قطعی انکار کر دینے کے لیے یہ علوم کوئی حجت فراہم نہیں کرتے، اور کسی چیز کے عدم کا حکم لگانے کے لیے صرف اتنی حجت کافی نہیں ہے کہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں پس "ریب وتذبذب" کا مقام وہ آخری مقام ہے جہاں آپ کے "علومِ جدیدہ" و "اکتشافاتِ حاضرہ" آپ کو لے جا کر ٹھیرا دیتے ہیں، مگر عقلی و ذہنی حیثیت سے یہ ایک بدترین مقام ہے، جو علوم انسان کو یقین نہ بخش سکیں، جو اسے ایک ایسے مقام پر معلق چھوڑ دیں جہاں اس کو کوئی جائے قرار نہ ملتی ہو، جو اسے "کافر تواں شد ناچار مسلمان شو" کی دلدل میں لے جا کر پھنسا دیں وہ یقیناً جہل سے بدتر ہیں۔

اس مشکل سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایمان بالغیب ہے، ایک دفعہ جب آپ نے ایک شخص کو نبی مان لیا اور یہ سمجھ لیا کہ وہ علومِ الٰہیہ میں کامل بصیرت رکھتا ہے

اور یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتا تو پھر آپ کے لیے امورِ غیب میں کسی تذبذب و ریب کی گنجائش نہیں رہتی اور آپ کا اعتقاد، یقین و اذعان کی ایک ایسی مضبوط بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے، جسے کسی "جدید علم" و "اکتشافِ حاضر" اور عمل و خیال کی کسی "نئی طرح" اور "حریتِ فکر و ضمیر" کی کسی گرم بازاری سے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لیے اور متقین کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (البقرہ ۲:۲-۳) اسی ایمان بالغیب پر مذہب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر آپ نے اصل الاصول کو منہدم کر دیا تو پھر مذہب کے ان بنیادی معتقدات کے متعلق، جن کی حقیقت معلوم کرنے کا خود آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، آپ کسی رائے پر نہیں پہنچ سکتے جس کی صحت کا خود آپ کو یقین ہو اور جس کی صداقت کا آپ دوسروں کو یقین دلا سکیں۔

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایک شخص کے متعلق یہ دریافت کرنے کا کون سا ذریعہ ہے کہ وہ نبی ہے، اس کو علومِ الٰہیہ میں کامل بصیرت حاصل ہے۔ اور وہ اس مرتبہ کا صادق انسان ہے کہ اگر وہ امورِ غیب کے متعلق ہم کو ایسی باتیں سنائے جو ہماری عقل سے ماوراء اور ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہوں تب بھی ہم اس کی بات پر ایمان لے آئیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ ہرگز جھوٹا نہیں ہے؟ اس سوال کا تصفیہ منحصر ہے دو چیزوں پر۔ ایک یہ کہ ہم اس شخص کی ذاتی سیرت کو اس سخت سے سخت معیار پر جانچ کر دیکھیں جس پر کسی انسان کی سیرت جانچی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس کی پیش کی ہوئی ان باتوں پر نگاہ ڈالیں جو ہمارے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہیں اور جن میں قطعیت کے ساتھ ایک حکمِ عقلی لگانا ہمارے لیے ممکن ہے۔ جب ان دونوں امتحانوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے صادق القول ہونے میں بے مثل ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے تمام عملی و فکری شعبوں میں خیر و صلاح و حکمت کی ایک کامل تعلیم دیتا ہے جس میں انسانی عقل کہیں سے کوئی عیب نہیں نکال سکتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو سچا نہ مانیں اور یہ گمان کریں کہ اس نے کسی علم و واقفیت کے بغیر محض دنیا کو دھوکا دینے کے لیے خدا اور فرشتوں اور عرش و کرسی اور وحی و الہام اور بعث بعد الموت اور دوزخ و جنت کا اتنا بڑا فریب گھڑ کر رکھ دیا ہے۔

پس حضرت نیاز کی تیسری غلطی یہ ہے کہ وہ قرآن کے پہلے حصے (جسے ہم نے اپنی تقسیم میں دوسرا حصہ قرار دیا ہے) قابلِ بحث نہیں سمجھتے اور مزید برآں یہ خیال کرتے ہیں کہ "اس

اور مذہبِ اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہے، برعکس اس کے ہم کہتے ہیں کہ ان کی تقسیم کے مطابق قرآن کے دوسرے اور تیسرے حصے (یا ہماری تقسیم کے مطابق پہلے حصے) کی صداقت کا فیصلہ منحصر ہی اس پر ہے کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور قرآن مجید کے ان تمام حصوں کی ناقدانہ چھان بین کریں جن کا تعلق امورِ غیب سے نہیں ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ اسلام کی تعلیم کا یہ ’’حصہ دوسرے مذاہب سے مختلف یا فروتر نہیں ہے۔‘‘ بلکہ بدلائل یہ ثابت کریں کہ وہ تمام ان مذاہب سے جو غیر اسلام ہیں اعلیٰ وارفع واجل ہے، جب تک بحث کا یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے دوسرے مرحلے (یعنی امورِ غیب کی بحث) میں قدم رکھنا اصولاً غلط ہے اور اس کے تصفیہ کے بغیر ان کا تصفیہ ممکن نہیں ہے۔

حضرت نیاز چاہتے ہیں کہ ہم ’’معاد‘‘ اور ’’کلامِ الٰہی‘‘ اور ان آیات سے بحث کریں جو عقائد اور قصص سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس بحث کے دو پہلو ہیں اور وہ دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو رسولِ اکرم ﷺ کی رسالت پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور اس بنا پر ان میں شک کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو آپؐ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے مگر امورِ غیب میں اس کو شک و شبہات ہیں۔ ان دونوں گروہوں سے بحث کرنے کے طریقے مختلف ہیں اور جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ معترض کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس وقت تک ہم اس سے بحث نہیں کر سکتے۔

پہلے گروہ سے معاد اور کلامِ الٰہی اور دوسرے امورِ غیب پر بحث کرنا بالکل بے نتیجہ ہے۔ کیوں کہ اصل میں اختلاف رہتے ہوئے فروع پر بحث کر کے نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ہم معاد اور کلامِ الٰہی حتیٰ کہ خود وجود و صفاتِ الٰہی کے متعلق بھی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اُن پر ہمارا ایمان و یقین اس بنا پر نہیں ہے کہ ہماری اپنی عقلی تحقیق یا ہمارے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ نے ان کے متعلق ہمیں کوئی ایسا قطعی اور یقینی علم بخشا ہے جس کے خلاف ہم پر کوئی دلیل عقلی قائم نہ کی جا سکتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ نبوت کی بحث سے بے نیاز ہو کر ان مسائل سے بحث کی جا سکتی تھی لیکن ان امور پر ہمارے قطعی ایمان و اذعان کی بنیاد دراصل اس اعتقاد پر ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ صادق القول ہیں، اور اپنی رسالت اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے متعلق جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسی اصل سے یہ بات متفرع ہوتی ہے کہ جب تک محمد ﷺ کی صداقت کے منکر سے ہم اس بنیادی مسئلہ کو تسلیم نہ کرالیں گے اس وقت تک کسی فروعی مسئلہ سے بحث ہی نہ کریں گے۔

رہا دوسرا گروہ تو اس کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ محمد ﷺ کی صداقت کو تسلیم بھی کرے اور پھر امورِ غیب پر اس جہت سے کلام بھی کرے کہ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اور محمد ﷺ نے جو کچھ خبریں دی ہیں، وہ صحیح ہیں یا غلط؟ اس لیے کہ یہ پہلو اختیار کرتے ہی وہ پہلے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ اور اگر وہ حقیقت میں دوسرے گروہ کا آدمی ہے تو اُسے ماننا پڑے گا کہ قرآن کا ہر لفظ صحیح ہے اور محمد ﷺ نے جو کچھ پیش کیا وہ غلطی سے مبرا ہے۔ البتہ وہ اس پر دو پہلوؤں سے کلام کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ فی الواقع قرآن میں ایسا اور ایسا ارشاد ہوا ہے یا نہیں؟ اور رسول اللہ ﷺ نے ایسا اور ایسا فرمایا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ قرآن اور سنت میں جو کچھ فی الواقع ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

آخر میں ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے۔ حضرت نیاز نے رائے دی ہے کہ ترجمان القرآن میں ایک باب المناظرہ کھولا جائے اور ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ وہ اپنے شبہات و اعتراضات بھی پیش کریں گے۔ جہاں تک اصطلاحی مناظرہ کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس سے دامن بچایا ہے اور اب بھی بچانا چاہتا ہوں، کیونکہ ایسی بحث کا میں ہرگز قائل نہیں ہوں جس کا مقصد محض دماغی ورزش اور عقلی کشتی ہو۔ رہا علمی مناظرہ جس کا مقصد احقاق و تحقیق ہو اور جس میں فریقین اس دلی خواہش کے ساتھ شریک ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک حق ہے اس کا اظہار کریں گے اور جو کچھ حق ثابت ہو جائے گا اس کو تسلیم کرلیں گے تو اس کے لیے میں ہر وقت آمادہ ہوں۔ ’’نگار‘‘ میں جن شبہات و اعتراضات کو پیش کیا جائے گا وہ بجنسہ ترجمان القرآن میں نقل کیے جائیں گے اور پھر جواب دیا جائے گا۔ اسی طرح امید ہے کہ ’’ترجمان القرآن‘‘ کے جواب پر اگر حضرتِ نیاز کوئی تنقید فرمائیں گے تو اصل جواب بھی اس کے ساتھ نقل فرمائیں گے، تاکہ دونوں رسالوں کے ناظرین بحث کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں، اور خود بھی کوئی رائے قائم کر سکیں۔ صرف ایک پہلو کو پیش کرنا اور دوسرے پہلو کو پیش کرنے سے احتراز کرنا میرے نزدیک خود اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۱۳۵۲ھ، جولائی ۱۹۳۳ء)

نوٹ: (یہ امر ناظرین کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا کہ اس مضمون کے جواب میں ''ترجمان القرآن'' کا تبادلہ جریدہ ''نگار'' سے بند ہوگیا اور آج تک بند ہے۔ کچھ لوگ ہمارے نیم پختہ نوجوانوں کو چند ظاہر فریب باتوں سے بہکانے کا کام تو خوب لیتے ہیں مگر علمی طریقہ پر باقاعدہ اور اصولی بحث کا جب موقع آتا ہے تو ان کا پائے چوبیں سخت بے تمکین ثابت ہوتا ہے)

ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص

مسلم یونیورسٹی کورٹ نے اپنے گزشتہ سالانہ اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء) میں ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے جو ایک عرصہ سے توجہ کا محتاج تھا، یعنی دینیات اور علومِ اسلامیہ کے ناقص طرزِ تعلیم کی اصلاح اور یونیورسٹی کے طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت۔ جہاں تک جدید علوم وفنون اور ادبیات کی تعلیم کا تعلق ہے حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں اس کا بہتر سے بہتر انتظام موجود ہے۔ کم از کم اتنا ہی بہتر جتنا خود علی گڑھ میں ہے۔ محض اس غرض کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک الگ یونیورسٹی قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک مستقل قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا تخیل جس بنا پر مسلمانوں میں پیدا ہوا اور جس بنا پر اس تخیل کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ ''مسلمان'' بھی رہنا چاہتے ہیں، یہ غرض سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پوری نہیں ہوتی۔ اسی کے لیے مسلمانوں کو اپنی ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی اپنی یونیورسٹی بھی یہ غرض پوری نہ کرے، اگر وہاں سے بھی ویسے ہی گریجویٹ نکلیں جیسے سرکاری یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، اگر وہاں بھی محض ''دیسی صاحب'' لوگ یا ہندی وطن پرست یا اشتراکی ملاحدہ ہی پیدا ہوں تو لاکھوں روپیہ کے صرف سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور چلانے کی کون سی خاص ضرورت ہے؟

یہ ایسا سوال تھا جس پر ابتدا ہی میں کافی توجہ کرنے کی ضرورت تھی۔ جب یونیورسٹی قائم کی جارہی تھی اس وقت سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے تھا کہ ہم کو ایک علیحدہ یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے اور اس وقت ضرورت کو پورا کرنے کی کیا سبیل ہے، مگر کسی نقاد نے

آج کل کے مسلمانوں کی تعریف میں شاید فٹ کی جائے کہ یہ کام پہلے کرتے ہیں اور بعد میں سوچتے ہیں۔ جن لوگوں کو یونیورسٹی بنانے کی دھن تھی انھیں بس یونیورسٹی ہی بنانے کی دھن تھی، اس کا کوئی نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ سوال سرے سے پیشِ نظر ہی نہ تھا کہ ایک مسلم یونیورسٹی کیسی ہونی چاہیے اور کن خصوصیت کی بنا پر کسی یونیورسٹی کو "مسلم یونیورسٹی" کہا جاتا ہے۔ اس عمل بلا فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ویسی ہی ایک یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی قائم ہوگئی جیسی ایک آگرہ میں اور دوسری لکھنؤ اور تیسری ڈھاکہ میں ہے۔ لفظ "مسلم" کی رعایت سے کچھ دینیات کا حصہ بھی نصاب میں شریک کر دیا گیا تاکہ جب کوئی دریافت کرے کہ اس یونیورسٹی کے نام میں لفظ "مسلم" کیوں رکھا گیا ہے تو اس کے سامنے قدوری اور منیۃ المصلی اور ہدایہ بطور سندِ اسلامیت پیش کر دی جائیں۔ مگر درحقیقت یونیورسٹی کی تاسیس و تشکیل میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی جس کی بنا پر وہ دوسری سرکاری یونیورسٹیوں سے ممتاز ہو کر حقیقی معنوں میں ایک "اسلامی یونیورسٹی" ہوتی۔

ممکن ہے کہ ابتدا میں تعمیر کے شوق اور جوش نے صحیح اور مناسب نقشہ پر غور کرنے کی مہلت نہ دی ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یونیورسٹی قائم ہوئے پندرہ سال ہوگئے اور اس دوران میں ہمارے تعلیمی ناخداؤں نے ایک مرتبہ یہ محسوس نہیں کیا کہ اس کی اصلی منزلِ مقصود کیا تھی اور ان کا رہرو پشت بمنزل جا کدھر رہا ہے۔ ابتداء سے حالات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ درس گاہ نہ اس ڈھنگ پر چل رہی ہے جس پر ایک اسلامی درس گاہ کو چلنا چاہیے اور نہ وہ نتائج پیدا کر رہی ہے جو دراصل مطلوب تھے۔ اس کے طلبہ اور ایک سرکاری یونیورسٹی کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں۔ اسلامی کیرکٹر، اسلامی اسپرٹ، اسلامی طرزِ عمل مفقود ہے۔ اسلامی تفکر اور اسلامی ذہنیت ناپید ہے۔ ایسے طلبہ کی تعداد شاید ایک فی صدی بھی نہیں جو اس یونیورسٹی سے ایک مسلمان کی سی نظر اور مسلمان کا سا نصب العین لے کر نکلے ہوں اور جن میں یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت نے یہ قابلیت پیدا کی ہو کہ اپنے علم اور اپنے قوائے عقلیہ سے کام لے کر ملتِ اسلامیہ میں زندگی کی کوئی نئی روح پھونک دیتے، یا کم از کم اپنی قوم کی کوئی قابلِ ذکر علمی و عملی خدمت ہی انجام دیتے۔ نتائج کی نوعیت اگر محض سلبی ہی رہتی تب بھی بسا غنیمت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور زیرِ تعلیم طلبہ میں ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی پائی جاتی ہے جس کا وجود اسلام اور

اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم کے لیے نفع نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے۔ یہ لوگ دینِ اسلام سے ناآشنا ہی نہیں بلکہ قطعاً منحرف ہو چکے ہیں۔ ان میں مذہب کی طرف سے سرد مہری ہی نہیں بلکہ نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا بنا دیا گیا ہے کہ وہ تشکیک کی حد سے گزر کر الحاد کے مقام تک پہنچ گئے ہیں، اور اصولِ اولیہ کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

حال میں خود مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نوجوانوں میں سے ایک صاحب نے جو محض اپنی سلامتِ طبع کی وجہ سے "مرتد" ہوتے رہ گئے، اپنے ایک پرائیویٹ خط میں وہاں کے حالات کی طرف چند مختصر اشارات کیے ہیں۔ یہ خط اشاعت کے لیے نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کی کیفیت بیان کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یونیورسٹی کی واقعی کیفیت کا نہایت صحیح مرقع ہے۔ صاحبِ خط نے خود اپنے ذہنی ارتقاء کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"علی گڑھ میں مجھے اسلامی دنیا سے خارج کرنے کے لیے تحریک کی آخری ارتقائی ضرب تھی۔ کمیونزم سے دوچار ہونا پڑا جس میں پہلے حریت کو محض ایک نعرہ سمجھتا تھا۔ لیکن علی گڑھ کے تجربات نے مجھے حقیقت سے روشناس کرا دیا۔ اسلامی ہند کے اس مرکز میں ایک خاص تعداد ایسے افراد کی موجود ہے جو اسلام سے مرتد ہو کر کمیونزم کے پرجوش مبلغ بن گئے ہیں۔ اس جماعت میں اساتذہ میں سے کافی لوگ شامل ہیں۔ اور یہ اساتذہ تمام ذہین اور ذکی نوجوان طلبہ کو اپنے جال میں پھانستے ہیں۔ ان لوگوں نے کمیونزم کو اس لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کی حمایت اور امداد کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی عملی سرگرمیاں ان کی بلند بانگ باتوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ بلکہ انھوں نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر تحریک کے سایہ میں اپنی اخلاقی کمزوریوں اور اپنے ملحدانہ رجحانات کو صحیح اور اپنی Loose Thinking کو Justify کر سکیں۔ کمیونزم نے پہلے مجھے بھی دھوکا دیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اسلام ہی کا ایک Unauthorised Edition ہے۔ لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کے اور اس کے بنیادی نصب العین میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم و تربیت صرف ناقص ہی نہیں بلکہ ان مقاصد کے بالکل برعکس نتائج پیدا کر رہی ہے جن کے لیے سرسید احمد خاں اور محسن الملک

اور وقار الملک وغیرہم نے ایک مسلم یونیورسٹی کی ضرورت ظاہر کی تھی اور جن کے لیے مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر جوش وخروش کے ساتھ اس درس گاہ کی تعمیر کا خیر مقدم کیا تھا۔

آپ اس انجینئر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جس کی بنائی ہوئی موٹر آگے چلنے کے بجائے پیچھے دوڑتی ہو؟ اور وہ انجینئر آپ کی نگاہ میں کیسا ماہر ہوگا جو اپنی بنائی ہوئی موٹر کو مسلسل اور پیہم الٹی حرکت کرتے دیکھتا رہے اور پھر بھی محسوس نہ کرے کہ اس کے نقشے میں کوئی خرابی ہے؟ غالباً ان صفات کا کوئی میکانیکل انجینئر تو آپ کو نہ مل سکے گا۔ لیکن آپ کی قوم کے تعلیمی انجینئر جس درجہ کے ماہرِ فن ہیں اس کا اندازہ آپ اس امرِ واقعہ سے کر لیجیے کہ وہ ایک تعلیمی مشین بنانے بیٹھے تھے جس کو اسلامی نصب العین کی جانب حرکت دینا مقصود تھا۔ مگر جو مشین انھوں نے بنائی وہ بالکل جانبِ مخالف میں حرکت کرنے لگی اور مسلسل پندرہ سال تک حرکت کرتی رہی اور ایک دن بھی اُن کو محسوس نہ ہوا کہ اُن کے نقشۂ تعمیر میں کیا غلطی ہے، بلکہ کوئی غلطی ہے بھی یا نہیں؟ بعد از خرابی بسیار اب یونیورسٹی کو یاد آیا ہے۔

"مسلم یونیورسٹی کے مقاصدِ اوّلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اسلامی روح پیدا کرے۔"

اور اس غرض کے لیے اس نے سات اشخاص کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے، جس کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ:

"تمام صورتِ حال کا جائزہ لے اور دینیات اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لیے ایسے جدید اور ترقی یافتہ ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کرے جو ضروریاتِ زمانہ سے مناسبت رکھتے ہوں اور جن سے اسلامی تعلیمات کو زیادہ اطمینان بخش طریق پر پیش کیا جا سکے۔"

بڑی خوشی کی بات ہے۔ نہایت مبارک باد ہے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر اب بھی ہمارے تعلیمی انجینئروں نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ ان کی تعلیمی مشین غلط نقشے پر بنی ہے اور اپنے مقصدِ ایجاد کے خلاف اس کے چلنے کی اصلی وجہ محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ نقشۂ تاسیس وتشکیل کی خرابی ہے، تو ہم خوشی کے ساتھ یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ مضیٰ مامضیٰ، آؤ اب اپنے پچھلے نقشے کی غلطیوں کو سمجھ لو اور ایک صحیح نقشہ پر اس مشین کو مرتب کرو۔

لیکن ہمیں شبہ ہے کہ اب بھی اپنی غلطی کا کوئی صحیح احساس ان حضرات میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ اب بھی وہ اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے نقشے میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ محض نتائج کی خوفناک ظاہری صورت ہی سے وہ متاثر ہوئے ہیں اور بالکل سطحی نگاہ سے حالات کو دیکھ رہے ہیں۔

خدا کرے ہمارا یہ شبہ غلط ہو۔ مگر پچھلے تجربات ہم کو ایسا ہی شبہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

پچھلی صدی کے وسط میں جب دو صدیوں کا پیہم انحطاط ایک خوفناک سیاسی انقلاب پر منتہی ہوا تھا، اس وقت مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو سنبھالنے کے لیے پردۂ غیب سے چند ناخدا پیدا ہو گئے تھے۔ وہ وقت زیادہ غور وخوض کا نہ تھا۔ یہ سوچنے کی مہلت ہی کہاں تھی کہ اس شکستہ جہاز کے بجائے ایک نیا اور پائیدار جہاز کس نقشے پر بنایا جائے۔ اس وقت تو صرف یہ سوال درپیش تھا کہ یہ قوم جو ڈوب رہی ہے اس کو ہلاکت سے کیوں کر بچایا جائے۔ ناخداؤں میں سے ایک گروہ نے فوراً اپنے اسی پرانے جہاز کی مرمت شروع کر دی، انہی پرانے تختوں کو جوڑا، ان کے رخنوں کو بھرا اور پھٹے ہوئے بادبانوں کو رفو کر کے جیسے تیسے بن پڑا ابھرنے کے قابل بنالیا۔ دوسرے گروہ نے لپک کر ایک نیا دخانی جہاز کرایہ پر لے لیا اور ڈوبنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پر سوار کرا دیا۔ اس طریقے سے دونوں گروہ اس اچانک مصیبت کو ٹالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ دونوں تدبیریں اس حیثیت سے کامیاب تھیں کہ انھوں نے فوری ضرورت کے لحاظ سے چارہ سازی کر دی اور ڈوبتوں کو ہلاکت سے بچا لیا۔ ان میں حکمت اور دانش مندی جو کچھ بھی تھی صرف اسی حد تک تھی۔ اب جو لوگ اس وقت کے نکل جانے کے بعد بھی انہی دونوں تدبیروں کو ٹھیک ٹھیک انہی دونوں شکلوں پر باقی رکھنا چاہتے ہیں، ان کا طرزِ عمل حکمت ودانش کے خلاف ہے۔ نہ تو پرانا بادبانی جہاز اس قابل ہے کہ مسلمان صرف اسی پر بیٹھ کر ان قوموں سے مسابقت کر سکیں جن کے پاس اس سے ہزار گنی زیادہ تیز رفتار سے چلنے والے کلدار جہاز ہیں۔ نہ کرایہ پر لیا ہوا دخانی جہاز اس لائق ہے کہ مسلمان اس کے ذریعہ سے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکیں کیوں کہ اس کا ساز وسامان تو ضرور نیا ہے، اور اس کی رفتار بھی تیز ہے اور وہ کلدار بھی ہے مگر وہ دوسروں کا جہاز ہے۔ اس کا ڈیزائن انہی کے مقاصد اور انہی کی ضروریات کے لیے موزوں ہے اور اس کے رہنما اور ناخدا بھی وہی ہیں، لہٰذا اس جہاز سے ہم کبھی یہ امید نہیں

کر سکتے کہ ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا بلکہ اس تیز رفتاری سے الٹا خطرہ یہ ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت پر لے جائے گا اور روز بروز ہمیں اپنی منزلِ مقصود سے دور کرتا چلا جائے گا۔ فوری ضرورت کے وقت تو وہ لوگ بھی حق بجانب تھے جنھوں نے پرانے جہاز کی مرمت کی، اور وہ بھی غلطی پر نہ تھے جنھوں نے کرایہ کے جہاز پر سوار ہو کر جان بچائی۔ مگر وہ بھی غلطی پر ہیں جو پرانے جہاز پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ اور وہ بھی غلطی پر ہیں جو اسی کرایہ کے جہاز پر جمے ہوئے ہیں۔

اصلی رہنما اور حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہادِ فکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقع کے لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ جس طریقہ کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا اسی طریقہ پر یہ اس وقت کے گزر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا، حال میں وہی غیر انسب ہے۔ پچھلی صدی کے رہنماؤں کے بعد اُن کے متبعین آج بھی اس روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر اُن کے رہنما اُنھیں چھوڑ گئے تھے۔ حالاں کہ وہ وقت جس کے لیے انھوں نے وہ روش اختیار کی تھی، گزر چکا ہے۔ اب اجتہادِ فکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

بد قسمتی سے ہم کو دونوں گروہوں میں ایک بھی مجتہد نظر نہیں آتا۔ انتہائی جرأت کر کے پرانے جہاز والوں میں سے کوئی اگر اجتہاد کرتا ہے تو بس اتنا کہ اپنے اسی پرانے جہاز میں چند بجلی کے بلب لگا لیتا ہے، کچھ نئے طرز کا فرنیچر مہیا کر لیتا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی دخانی کل خرید لاتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکا دیتی رہے کہ یہ پرانا جہاز اب نیا ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نئے جہاز والے اگرچہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمتِ مخالف پر بہے چلے جا رہے ہیں، مگر دو چار پرانے بادبان بھی لے کر بیسویں صدی کے اس اپ ٹو ڈیٹ جہاز میں لگائے ہوئے ہیں تا کہ اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکا دے سکیں کہ یہ جہاز بھی ''اسلامی جہاز'' ہے اور لندن کے راستے سے حج کعبہ کو چلا رہا ہے۔

اندھی تقلید اور اس کے ساتھ اجتہاد کی یہ جھوٹی نمائش تا کجے؟ ایک طوفان گزر گیا اب دوسرا طوفان بہت قریب ہے۔ ہندستان میں ایک دوسرے سیاسی انقلاب کی بنا پڑ رہی ہے۔

ممالک عالم میں ایک اور بڑے انقلاب کے سامان ہو رہے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ ہندستان میں موقع انقلاب کے بجائے ایک بالکل غیر متوقع اور ہزار درجہ زیادہ خطرناک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آنے والے انقلابات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی بہ نسبت اپنی نوعیت اور اپنی شدت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں کی اعتقادی و ایمانی و اخلاقی و عملی حالت جیسی کچھ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ان آنے والے طوفانوں کی ایک ٹکر بھی خیریت کے ساتھ سہہ سکیں گے۔ ان کا پرانا جہاز دورِ جدید کے کسی ہولناک طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاید ایک ہی تھپیڑے میں اس کے تختے بکھر جائیں اور اس کے بادبانوں کا تار تار الگ ہو جائے رہا ان کا کرایہ کا جہاز تو وہ پرانے جہاز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو لوگ اس پر سوار ہیں ہمیں خوف ہے کہ طوفانی دور کا پہلا ہی تھپیڑا اُن کو ملت اسلامیہ سے جدا کر کے شاید ہمیشہ کے لیے ضلالت کے قعرِ عمیق میں لے جائے گا، لاقدر اللہ۔ پس اب یہی وقت ہے کہ مسلمان پرانے جہاز سے بھی نکلیں اور کرایہ کے جہاز سے بھی اتریں اور خود اپنا ایک جہاز بنائیں جس کے آلات اور کل پُرزے جدید ترین ہوں، مشین موجودہ دور کے تیز سے تیز جہاز کے برابر ہو، مگر نقشہ ٹھیٹھ ''اسلامی جہاز'' کا ہو اور اس کے انجینئر اور کپتان اور دیدبان سب وہ ہوں جو منزلِ کعبہ کی راہ و رسم سے باخبر ہوں۔

استعارہ کی زبان چھوڑ کر اب ہم کچھ صاف صاف کہیں گے۔ سرسید احمد خاں (خدا ان کو معاف کرے) کی قیادت میں علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں، تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچا لیں اور ملک کے جدید نظم و نسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے، مگر اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی، نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل درآمد کیا جا سکتا۔ لہٰذا وقتی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اسی طرزِ تعلیم کی طرف ڈھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا، اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر

اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا، جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی جو ایک آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طریق پر اختیار کر لی گئی تھی۔ اب وہ وقت گزر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی۔ وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا، اور وہ خطرات بھی واقعہ کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اس وقت صرف موہوم تھے۔ اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنا دی، مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں ’’کالے فرنگی‘‘ پیدا کیے۔ اس نے ہم میں ’’انگلو محمڈن‘‘ پیدا کیے اور وہ بھی ایسے جن کی نفسیات میں ’’محمڈن‘‘ اور ’’انڈین‘‘ کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔ اُس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادّی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے، چند خطابات اور چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ موجود ہے، جہاں سے دھڑا دھڑ ’’انگلو محمڈن‘‘ اور ’’انگلو انڈین‘‘ نکل رہے ہیں۔ پھر یہ بس بھری فصل کاٹنے کے لیے ہم کو اپنا ایک مستقل مزرعہ رکھنے کی حاجت ہی کیا ہے؟ اگر درحقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود ہے تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور ان کو دور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔

جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے، اگر ہم اس کو بجنسہٖ لے کر اپنی نوخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے کھو دیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علومِ عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصولِ عمران سے یکسر مختلف ہے۔

آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیرِ اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیۃً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی؟ ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی؟ ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے۔ اس قسم کے عملِ تقلیم سے کوئی خوشگوار پھل حاصل نہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں، مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنے گا۔

اگر فی الواقع علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظرِ ثانی کیجیے۔ ان علوم کو جوں کا توں لینا ہی درست نہیں ہے۔ طالب علموں کی لوحِ سادہ پر اُن کا نقش اس طرح مرتسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔ تنقید کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر پیدا ہوتی بھی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد سالہا سال کے گہرے مطالعہ سے جب کہ وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں پہنچ جاتا ہے اور کسی عملی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرزِ تعلیم کو بدلنا چاہیے۔ تمام مغربی علوم کو طلبہ کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجیے اور یہ تنقید خالص اسلامی نظر سے ہو تاکہ ہر ہر قدم پر ان کے ناقص اجزاء کو چھوڑتے جائیں اور صرف کارآمد حصوں کو لیتے جائیں۔

اس کے ساتھ علومِ اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیجیے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجیے۔ ان کی اصلی اسپرٹ دلوں میں اتاریے اور ان کا صحیح تدبر دماغوں میں پیدا کیجیے۔ اس غرض کے لیے آپ کو بنا بنایا نصاب کہیں نہ ملے گا۔ ہر چیز ازسرِنو بنانی ہوگی۔ قرآن اور سنت رسولؐ کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ ان کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہییں جو قرآن اور سنت کے مغز کو پا چکے ہوں۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے مگر یہاں کی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی، آپ کو معاشیات کی تعلیم میں اسلامی نظمِ معیشت کے اصول، قانون کی تعلیم میں اسلامی قانون کے مبادی، فلسفہ کی کتابوں میں حکمتِ اسلامیہ کے نظریات، تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفۂ تاریخ کے حقائق اور اسی طرح علم و فن کی

تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمراں عنصر کی حیثیت سے داخل کرتا ہوگا۔

آپ کے تعلیمی اسٹاف میں جو ملاحدہ اور متفرنجین بھر گئے ہیں ان کو رخصت کیجیے۔ خوش قسمتی سے ہندستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ کی بصیرت رکھنے کے ساتھ دل و دماغ اور نظر و فکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان بکھرے ہوئے جواہر کو جمع کیجیے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک اسکیم بنائیں۔

آپ کہیں گے کہ انگریز ایسی تعمیر کی اجازت نہ دے گا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر آپ اس سے پوچھیے کہ تو پورے مسلمان اور پورے کمیونسٹ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک کو بہر حال تجھے قبول کرنا ہوگا۔ ۱۹۱۰ء کا ''انگلو محمڈن'' مسلمان اب زیادہ مدت تک نہیں پایا جا سکتا۔ اب اگر تو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو پورا کمیونسٹ دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی قدیم اسلامی دشمنی پر جما رہ۔ نتیجہ خود سامنے آجائے گا۔ اگر یہ منظور نہیں تو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندستان میں کمیونزم کی بڑھتی ہوئی وبا کا مقابلہ صحیح النسب سانڈوں اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس وبا کو صرف ایک طاقت روک سکتی ہے اور وہ اسلام کی طاقت ہے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاولیٰ ۵۵ھ، اگست ۱۹۳۶ء)

ملت کی تعمیر نو کا صحیح طریقہ

اصلاح اور انقلاب دونوں کا مقصد کسی بگڑی ہوئی حالت کا بدلنا ہوتا ہے لیکن دونوں کے محرکات اور طریق کار میں اساسی فرق ہوا کرتا ہے۔ اصلاح کی ابتداء غور و فکر سے ہوتی ہے۔ ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچ بچار کر کے انسان حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ خرابی کے اسباب پر غور کرتا ہے، خرابی کے حدود کی پیمائش کرتا ہے، اس کے ازالہ کی تدبیریں دریافت کرتا ہے اور اس کو دور کرنے کے لیے صرف اسی حد تک تخریبی قوت استعمال کرتا ہے، جس حد تک اس کا استعمال ناگزیر ہو۔ بخلاف اس کے انقلاب کی ابتداء غیظ و غضب اور جوشِ انتقام کی گرمی سے ہوتی ہے۔ خرابی کے جواب میں ایک دوسری خرابی مہیا کی جاتی ہے، جس بے اعتدالی سے بگاڑ ہوا تھا اس کا مقابلہ ایک دوسری بے اعتدالی سے کیا جاتا ہے، جو برائیوں کے ساتھ اچھائیوں کو بھی غارت کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایک اصلاح پسند کو بھی وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو ایک انقلاب پسند کرتا ہے۔ دونوں نشتر لے کر جسم کے ماؤف حصہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ اصلاح پسند پہلے اندازہ کر لیتا ہے کہ خرابی کہاں ہے اور کتنی ہے پھر نشتر کو اسی حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے اور نشتر کے ساتھ مرہم بھی تیار رکھتا ہے۔ لیکن انقلاب پسند اپنے جوشِ غضب میں آنکھیں بند کر کے نشتر چلاتا ہے، اچھے بُرے کا امتیاز کیے بغیر کاٹتا چلا جاتا ہے، اور مرہم کا خیال اگر اس کے دل میں آتا ہے تو اس وقت جب خوب قطع و برید کر لینے اور جسم کے ایک اچھے خاصے حصے کو غارت کر چکنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

عموماً جہاں خرابیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں، وہاں لوگ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے کھو

بیٹھتے ہیں، اور بگڑے ہوئے حالات سے جو تکلیف ان کو پہنچتی ہے وہ انھیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے اصلاح کی کوشش کریں۔ اس لیے ایسے حالات میں عام طور پر اصلاحی تحریکات کے بجائے انقلابی تحریکات کا زور ہوتا ہے۔ قدامت پسند اور انقلاب پسند جماعتوں میں سخت کشمکش برپا ہوتی ہے جس سے غضب و انتقام کی آگ کو اور زیادہ ایندھن مل جاتا ہے۔ دونوں فریق ضد اور ہٹ دھرمی کے انتہائی سروں پر پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں حق و صداقت کا گلا کاٹتے ہیں۔ ایک طرف سے حق کے بجائے باطل کی مدافعت میں انتہائی قوت صرف کی جاتی ہے۔ دوسری طرف حق اور باطل کا امتیاز کیے بغیر سب پر اندھا دھند حملے کیے جاتے ہیں۔ آخر کار جب انقلاب پسندوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ ہر اس چیز کو تباہ کر دیتے ہیں جو قدامت پسندوں کے پاس تھی، خواہ وہ حق ہو یا باطل، صحیح ہو یا غلط۔ انقلاب ایک سیلاب کی طرح بڑھتا ہے، اور بلا امتیاز اچھے بُرے سب کو غارت کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر تخریب کر چکنے کے بعد جب عقل اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے تو تعمیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مگر انقلابی ذہنیت اس میں بھی نرالے انداز ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہے۔ ہر اس چیز کو چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جو قدامت پسندوں کے پاس تھی خواہ کوئی چیز بجائے خود صحیح ہو لیکن انقلاب کی نگاہ میں کسی چیز کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ وہ قدیم نظام کی طرف منسوب ہو۔ اس طرح ایک کافی مدت تک نئے انقلابی اصولوں پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب نئے نئے تجربوں اور ناکامیوں سے انقلابی دماغ تھک جاتا ہے تب کہیں جا کر وہ اس اعتدال کے نقشے پر آتا ہے جو ابتدا ہی سے اصلاح پسند کے پیش نظر تھا۔

آنچہ دانا کند کند ناداں   لیک بعد از خرابیِ بسیار

موجودہ زمانے میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال بولشویک انقلاب ہے، نظامِ تمدن کی جو انتہائی بگڑی ہوئی حالت شہنشاہی روس میں قائم تھی وہ جب اہلِ ملک کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تو اس کے جواب میں ایک انقلابی تحریک رونما ہوئی۔ یورپ کے اشتراکی اور جمہوری نظریات نے روس میں فروغ پانا شروع کیا۔ سلطنت اور اس کے پروردہ طبقوں نے اپنے ناجائز فوائد کی حفاظت کے لیے جابرانہ قوتیں استعمال کیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب پسندوں میں صرف شاہی مطلق العنانی اور دولت کی ناروا تقسیم ہی کے خلاف نہیں، بلکہ اس پورے

نظام تمدن کے خلاف جو صدیوں سے متوارث چلا آ رہا تھا غضب کے جذبات بھڑکنے لگے۔ آخر کار مارکس کے ہیولیٰ نے لینن کی صورت اختیار کی۔ زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ان تمام سیاسی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، مذہبی اصولوں کو بھی یک قلم مٹا دیا گیا جن پر انقلاب سے پہلے کی سوسائٹی قائم تھی۔ اس کامل تخریب کے بعد بالکل نئے اشتراکی اصولوں پر ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر شروع کی گئی اور ان نئے معماروں نے اپنی تمام دماغی قوتیں اس کوشش میں صرف کر دیں کہ بورژوا طبقہ کے ترکہ میں سے ایک چیز بھی ان کی نئی عمارت میں شامل نہ ہونے پائے حتیٰ کہ خدا کو بھی سوویت روس سے باہر نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا۔ لیکن اب جتنا جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے تعمیری عقل انقلابی جنون کی جگہ لیتی جاتی ہے اور وہ انتہائی بولشویت جو انقلاب کی ابتداء میں کارفرما تھی اعتدال کے نقطہ کی طرف واپس ہوتی جا رہی ہے۔

ایسی ہی انتہا پسندی انقلاب فرانس کے زمانہ میں بھی رونما ہوئی تھی۔ اس وقت بھی جوشِ انقلاب میں اچھے اور بُرے سب کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ اور نئے نئے انقلابی اصول وضع کر کے ان کو رواج دیا گیا۔ لیکن اس شدید انقلابی بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج فرانس کا سیاسی، تمدنی، اخلاقی مزاج پوری طرح اعتدال پر نہیں آ سکا ہے اور آج اس کی قومی زندگی کو کسی شعبہ میں بھی وہ استحکام نصیب نہیں ہے جو انگلستان کو حاصل ہے۔

ایک اور مثال ترکی انقلاب کی ہے جہاں اسی انقلابی ذہنیت نے کوشش کی کہ ایک قوم کو جادو کے زور سے آن کی آن میں ایک دوسری قوم بنا دیا جائے۔ اس کوشش میں پھوڑوں اور پھنسیوں پر نشتر چلانے کے ساتھ جسم کے اچھے خاصے تندرست حصوں کو بھی کاٹ پھینکا گیا۔ اور ان کی جگہ یورپ سے کچھ نئے اعضاء منگوا کر لگائے گئے حتیٰ کہ پرانے دماغ کی جگہ بھی ایک نیا دماغ نئی ٹوپی کے ساتھ حاصل کیا گیا۔ لیکن مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند ترکوں کو آہستہ آہستہ یہ سبق مل رہا ہے کہ ہر پرانی چیز کو برا اور ہر نئی چیز کو اچھا سمجھنے کا جو قاعدہ کلیہ انھوں نے بنا لیا تھا وہ درست نہیں ہے، چنانچہ اکثر نئے تجربوں سے کافی نقصان اٹھانے کے بعد اُن کو افراط سے اعتدال کی طرف پسپا ہونا پڑا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس وقت ہندستانی مسلمانوں میں بھی ایک انقلابی بحران رونما ہے اور اس بحران کے بُرے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قدامت پسند

اور انقلاب پسند دونوں جماعتوں کو غور وفکر کی دعوت دیں۔

یہاں حالات کا بگاڑ وہی ہے جو ترکی اور دوسرے مسلم ممالک میں تھا اور ہے۔ صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھوں میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد وغیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی، ساتویں ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی موقوف ہوگئی ہے۔ وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں تو یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانہ کی نیرنگی اور قوت کے سیلان وتجدد سے انھوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی، دنیا کے حالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئے۔ تمدن کے معاملات اور مسائل نے کتنے پلٹے کھائے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا۔ انھوں نے زمانے کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی۔ نئے تغیرات سے بے اثر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانہ کے ساتھ چلنے سے روک دیں، بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کرلے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدت تک کامیاب ہوسکتی تھی اور ہوئی۔ مگر دائماً ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ جو قوم دنیا کے ساتھ میل جول اور معالات رکھتی ہو وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے نئے مسائل سے غیر متاثر رہ سکتی ہے؟ اگر اس کے رہنما اس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی اور عملی راہوں میں اس کی رہبری نہ کریں گے تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ ان کی قیادت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہوجائے گی۔

اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور اُن سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل قرار پاگئے۔ حالاں کہ اسلام میں اُن کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔ ملتِ اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید، پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت، پھر اہل علم وبصیرت کا اجتہاد۔ لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل اُلٹ دیا گیا، اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہل بصیرت کا اجتہاد، پھر سنت رسول اللہ ﷺ اور سب سے آخر میں قرآن۔ یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن وغیر متحرک شے بنادیا ہے۔

ائمہ فقہ، متکلمین، مفسرین، اور محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم وفضل اور ان کی جلالتِ شان سے کون انکار کرسکتا ہے؟ مگر وہ انسان تھے۔ اکتسابِ علم کے وہی ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اپنی عقل وبصیرت کے ساتھ کلام اللہ وسنتِ رسول اللہؐ میں غور وفکر کرتے تھے۔ اور جو اصول ان کے نزدیک محقق ہوجاتے تھے انہی سے وہ قوانین اور عقائد کے فروع مستنبط کرلیا کرتے تھے۔ ان کے یہ اجتہادات ہمارے لیے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں مگر بجائے خود اصل منبع نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کرکے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیوں کہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی ومکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوندِ عالم ہے، جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس علم کا فیضان قرآن کی آیات اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی درحقیقت ایسا مأخذ اور سرچشمہ بن گیا ہے، جس سے ہمیشہ اور ہر زمانہ کے لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم، افکار اور قوانین اخذ کرتے ہیں۔ جب تک علمائے اسلام اس مأخذ ومنبع سے اکتسابِ علم کرتے رہے۔ اس وقت تک اسلام زمانہ کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور وفکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہوگئی۔ جب آنکھیں بند کرکے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی۔ جب پچھلے فقہاء اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنالیا گیا۔ جب کتاب وسنت سے براہِ راست اکتسابِ علم ترک کردیا گیا، اور جب کتاب وسنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنالیے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتہً رک گئی۔ اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم وعمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح وتفسیر میں منہمک ہوگئے۔ جزئیات وفروع میں جھگڑنے لگے، نئے نئے مذاہب نکالنے اور دوراز کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے۔ اور اس دریادلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر وفسق تقسیم کیا گیا کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝ (النصر:۲) کی جگہ یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا

تماشا دنیا نے دیکھا، اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ (الفتح: ۲۹) کی جگہ رُحَمَاءُ عَلَی الْکُفَّارِ اَشِدَّاءُ بَیْنَھُمْ کے مناظر ہر طرف نمایاں ہوئے اور تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی (الحشر: ۱۴) کی جو کیفیت منافقین و کفار کے حق میں بیان ہوئی تھی، وہ مسلمانوں کا حال بن گئی۔

سیاسی حرکت کی رجعت ہے جسے آج ہم ایک خوف ناک انقلابی بحران کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے مذہبی رہنما اُن کی قیادت کا فرض انجام نہیں دے رہے، بلکہ آگے بڑھانے کے بجائے انھیں الٹا پیچھے کھینچے لیے جاتے ہیں تو وہ اُن کے قابو سے نکلنے لگے، اور جیسا کہ ایک بے سری فوج کا حال ہوتا ہے انھوں نے ہر وادی میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ نے مذہب کے علم برداروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا سارا الزام خود مذہب پر تھوپا، اپنی ترقی کی راہ میں اسی کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا، اور علانیہ کہنا شروع کیا کہ مذہب کو چھوڑو اور ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کرو۔ ایک دوسرے گروہ نے علماء اور مذہبی پیشواؤں کو گالیاں دینا اپنا شعار بنا لیا۔ گویا اسی سب و شتم اور زبان درازی میں مسلمانوں کی فلاح و ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ ایک اور گروہ اٹھا اور اس نے مذہب کی قطع و برید شروع کر دی۔ کسی نے فقہاء اور ائمہ پر زبانِ طعن دراز کی، کسی نے فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی لپیٹ لیا، کسی نے قرآن کے احکام اور تعلیمات میں بھی ترمیم کی ضرورت سمجھی، کسی نے کہا کہ دین اور دنیا کو الگ الگ کر دو، دین کا تعلق صرف عقائد اور عبادات سے رہنا چاہیے باقی رہے دنیوی معاملات تو اُن میں مذہب اور اس کے قوانین کا کچھ دخل نہیں۔

اس طرح مختلف جماعتیں ان بگڑے ہوئے حالات کو بدلنے کے لیے کھڑی ہو گئی ہیں مگر ان کا رجحان اصلاح کی جانب نہیں بلکہ انقلاب کی جانب ہے۔ انھوں نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا کہ اصل خرابی کیا ہے؟ کہاں سے پیدا ہوئی؟ کس حد تک خرابی ہے اور اس اصلاح کی صحیح صورت کیا ہے؟ محض تخمیناً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خرابی ہے اور اس کو دور کرنے کے لیے دیوانہ وار نشتر چلائے جا رہے ہیں، چاہے اس سے مرض کے ساتھ مریض کا بھی کیوں نہ خاتمہ ہو جائے۔

آزاد ممالک میں تو کہا جا سکتا ہے اور یہ کہنا ایک حد تک درست بھی ہے کہ کسی انقلابی حرکت کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ وہاں ایک گروہ کے ہاتھ میں حکومت کا عملی اقتدار ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اس اقتدار کو مٹانے میں ایک شدید انقلابی حرکت کے بغیر مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انقلاب کے معاملے میں جب عملاً انتہائی سختی کی نوبت آن پڑتی ہے تو زمانے کے تجربات بہت جلد ان کی تصحیح کر دیتے ہیں اور انھیں مجبوراً افراط کی روش چھوڑ کر اعتدال کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے لیکن ہمیں یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہم اس وقت غلامی کی حالت میں ہیں اور ہمارے حالات آزاد ملکوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں اول تو کسی انقلابی حرکت کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ کسی شدید اور طاقت ور مزاحمت کا خوف نہیں ہے جس کے مقابلہ میں ایک معتدل اصلاحی تحریک کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔ دوسرے اگر کوئی انقلابی حرکت جاری ہو اور وہ کامیاب ہو جائے تو مدت ہائے دراز تک اس کے اعتدال پر آنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ انقلاب کے علم برداروں پر سے کسی قوت قاہرہ کا بوجھ نہ ہوگا جو ان کی افراط پسندی کو اعتدال کی طرف مائل کر سکتا ہو۔ لہٰذا یہاں کی انقلابی حرکت بلکہ صحیح الفاظ میں بہت سی انقلابی حرکات کے دیر تک جاری رہنے کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ مسلم سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ سب کی سب متزلزل ہو جائیں گی اور ان کی جگہ کوئی ایسی مستحکم بنیاد قائم نہ ہو سکے گی جس پر از سر نو ایک نظام اجتماعی تعمیر کیا جا سکے۔ پھر غور کرنا چاہیے کہ جو قوم پہلے ہی غلامی اور کمزوری کی حالت میں ہے اس کے نظام اجتماعی کو اگر اس طرح منہدم کر کے پارہ پارہ کر دیا گیا تو وہ اخلاقی انحطاط کے کن گڑھوں میں جا گرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ہم قدامت پسندوں سے زیادہ انقلاب پسندوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ورنہ جہاں تک بگڑے ہوئے حالات کا تعلق ہے ان کو بدلنے کی ضرورت میں ہم بھی اُن سے متفق ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ جو جمود اسلام میں پیدا کر دیا گیا ہے اس کو حرکت سے بدل دیا جائے لیکن ہمارے نزدیک اس حرکت کے پیدا کرنے کی یہ کوئی صحیح تدبیر نہیں ہے کہ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر فرنگیت اختیار کی جائے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ علم و تحقیق اور غور و فکر کے بغیر مذہب کی قطع و برید شروع کر دی جائے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ گزشتہ زمانے کے مجتہدین نے اپنی محنتوں اور کاوشوں سے جو عمارتیں قائم کی تھیں ان کو خواہ مخواہ ڈھا دیا جائے، نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ حدیث کے سارے ذخیرہ کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ کلامِ الٰہی میں انسان اپنی عقل سے ترمیم و تنسیخ کریں، یہ سب تدبیریں تو اصلاح کی نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سخت فساد برپا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ صحیح علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ

جس ترتیب کو اُلٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کر دیا جائے۔ قرآن کو وہی پیشوائی کا مقام دیجیے جو دراصل اس کا مقام تھا۔ حدیث کو وہی مرتبہ دیجیے جو عہدِ رسالت میں خود رسول اکرمؐ اور آپ کے اصحاب اور اہلِ بیت، آپ کے اقوال اور اعمال کو دیتے تھے۔ فقہاء، متکلمین، مفسرین اور محدثین کے کارناموں کو وہی مرتبہ دیجیے جو خود ان بزرگوں نے دیا تھا، اُن سے فائدہ اٹھایئے جن چیزوں کے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے انھیں بدستور رہنے دیجیے مگر کبھی یہ نہ سمجھیے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں وہ اٹل قانون ہے یا اُن کی کتابوں نے ہم کو قرآن مجید میں غور وفکر اور احادیثِ نبوی کی تحقیق سے بے نیاز کر دیا ہے یا ان کے بعد کتاب وسنت سے براہ راست اکتسابِ علم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

یہ ترتیب اگر پھر سے قائم ہو جائے تو اسلام کی رکی ہوئی گاڑی پھر حرکت کرنے لگے گی۔ کیوں کہ جمود کی اصلی وجہ یہی تو ہے کہ انجن ریل سے کاٹ کر پیچھے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ڈرائیور کو بھی انجن سے الگ کر کے کہیں پیچھے کے ڈبوں میں بٹھا دیا گیا ہے اور سب سے آگے کے ڈبہ پر بھروسہ کر لیا گیا ہے کہ وہ خود بھی چلے گا اور ساری ریل کو بھی چلائے گا۔

مگر اس کام میں غصے اور جوش کی ضرورت نہیں۔ غصہ تو وہاں ہو جہاں عمداً کوئی ظلم کیا گیا ہو، اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے عمداً نہیں ہوا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علماء نے کہیں کوئی کانفرنس کر کے طے کیا تھا کہ ہم اسلام پر جمود طاری کریں گے اور اس کی بڑھتی ہوئی گاڑی روکیں گے۔ یہ تو محض نتیجہ ہے اس انحطاط کا جو چھٹی، ساتویں صدی سے مسلمان قوموں کی سیاسی، فوجی، معاشی، اور تمدنی قوتوں کے ساتھ ان کی علمی، عقلی اور فکری قوتوں میں رونما ہو رہا ہے۔ اس انحطاط نے جس طرح مسلمانوں کی روحِ جہاد کو پژمردہ کیا ہے اسی طرح ان کی روحِ اجتہاد کو بھی افسردہ کر دیا ہے۔ جس طرح زندگی کے جملہ مسائل کے متعلق مسلمانوں کے نظریے بدلے اسی طرح امورِ دینی وعلمی کے متعلق بھی ان کے نظریے بدل گئے اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ان کی تمام ذہنی قوتوں پر مردنی چھاتی چلی گئی۔ اس کا الزام نہ علماء کو دیا جا سکتا ہے نہ اُن کے متبعین کو۔ اگر آپ چاہیں تو فطرت پر اس کا الزام رکھ دیجیے مگر نہ الزام رکھنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ غضب اور اس کے تخریبی جوش سے۔ اصلاح کی صحیح صورت بس یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے خرابیوں کے اسباب اور ان کے حدود کو تلاش کیجیے اور حکمت کے ساتھ ان کو خوبیوں سے بدل دیجیے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاول ۵۳ھ، جولائی ۱۹۳۴ء)

بغاوت کا ظہور

قوم دو طبقوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ایک طبقۂ عوام، دوسرا طبقۂ خواص۔ طبقۂ عوام اگرچہ کثیر التعداد ہوتا ہے اور قوم عددی قوت اسی طبقہ پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن سوچنے اور رہنمائی کرنے والے دماغ اس گروہ میں نہیں ہوتے۔ نہ یہ لوگ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ نہ اُن کے پاس مالی قوت ہوتی ہے، نہ جاہ ومنزلت رکھتے ہیں، نہ حکومت کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے قوم کو چلانا ان لوگوں کا کام نہیں ہوتا، بلکہ محض چلانے والوں کے پیچھے چلنا ان کا کام ہوتا ہے۔ یہ خود راہیں بنانے اور نکالنے والے نہیں ہوتے بلکہ جو راہیں اُن کے لیے بنا دی جاتی ہیں انھی پر چل پڑتے ہیں۔ راہیں بنانے اور ان پر پوری قوم کو چلانے والے دراصل خواص ہوتے ہیں۔ انھی پر قوم کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہوتا ہے، ان کی راست روی پوری قوم کی راست روی اور ان کی گمراہی پوری قوم کی گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی بہتری کے دن آتے ہیں تو ان میں ایسے خواص پیدا ہوتے ہیں جو خود راہ راست پر چلتے اور پوری قوم کو اس پر چلاتے ہیں۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (الانبیاء: ۷۳) ”ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی ہدایت کی۔“ اور جب کسی قوم کی تباہی کا زمانہ آتا ہے تو اس کے بگاڑ کی ابتداء اس کے خواص سے ہوتی ہے جن کی گمراہی اور فسادِ اخلاق سے آخر کار ساری قوم ضلالت اور بدعملیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے: وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝ (بنی اسرائیل: ۱۶) ”جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم

اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

قرآن کی اصطلاح میں خواص قوم کو "مترفین" کہا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے خوب سرفراز کیا ہو۔ خداوند عالم کی شہادت کے مطابق ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ پہلے یہ مترفین بستیوں میں فسق و فجور اور ظلم و عدوان اختیار کرتے ہیں، پھر ساری کی ساری بستیاں بدی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اس شہادت کے صادق ہونے میں کیا کلام ہے؟ ہماری اپنی قوم کا حال دیکھ لو۔ اس کا بگاڑ بھی ہمارے مترفین ہی سے ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اس طریقے کو جو احکام الٰہی کے مطابق ہدایت کرنے والے ائمہ کا طریقہ تھا چھوڑ دیا اور شیطانی طریقوں کی پیروی شروع کر دی۔ انھی نے فراعنہ اور قیاصرہ کی طرح خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرانی شروع کی، اور اپنی قوم کو خدا پرستی کی جگہ بادشاہ پرستی اور امراء پرستی کا خوگر بنایا۔ انھی نے ان گردنوں کو بندوں کے آگے جھکنا سکھایا جنھیں صرف خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ انھی نے خوش نما لباسوں اور شان دار محلوں میں معاصی اور جرائم کا ارتکاب کر کے اپنی قوم کے لیے معاصی و جرائم کو خوش نما بنایا۔ انھی نے حرام کے مال کھا کر اپنی قوم کو حرام کھانے اور حرام کھلانے کی عادت ڈالی۔ انھی نے علم کو ضلالت کے لیے، عقل و فکر کو شرارت کے لیے، ذہانت کو مکر و فریب اور سازشوں کے لیے، دولت کو ایمان خریدنے کے لیے، حکومت کو ظلم و جور کے لیے اور طاقت کو استکبار کے لیے استعمال کیا۔ پھر یہی ہیں جنھوں نے حقوق اور منافع تک پہنچنے اور ترقی کرنے کے اکثر جائز راستے بند کر دیے اور لوگوں کو مجبور کر دیا کہ خوشامد، رشوت، جھوٹ، سازش اور ایسے ہی دوسرے ذلیل راستوں سے اپنے مقاصد کو پہنچیں۔ غرض اخلاق و اعمال کا کوئی فساد ایسا نہیں ہے جس کا آغاز ان مترفین سے نہ ہوا ہو۔ ان کو اللہ نے جو نعمتیں عطا کی تھیں ان کو انھوں نے غلط طریقوں سے استعمال کیا۔ خود بھی بگڑے اور اپنے ساتھ قوم کو بھی بگاڑا۔ ضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا۔

یہ سب کچھ صدیوں سے ہو رہا تھا اور اخلاقی فساد کا گھن مسلمانوں کی قومی طاقت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود دلوں میں کم از کم ایمان کی روشنی موجود تھی، احکامِ خدا و رسول کی پابندی چاہے نہ ہو مگر خدا اور رسول کی عظمت دلوں میں باقی تھی، قانونِ اسلام کی خلاف ورزی چاہے کتنی ہی کی گئی ہو مگر قانون کے احترام سے دل خالی نہ ہوئے تھے۔ اسلام کی

حکومت سے انحراف خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو مگر اس کے مقابلہ میں بغاوت کی جرأت کبھی نہ ہوئی تھی۔ جس کو اسلام نے حق کہا تھا اس کو حق ہی مانا جاتا تھا اگرچہ اس کو چھوڑ کر باطل کی پیروی میں کتنا ہی غلو کیوں نہ کیا گیا ہو۔ یہ جسارت کسی میں نہ تھی کہ اسلام کے بتائے ہوئے حق کو باطل، باطل کو حق، فرض کو لغو و مہمل، جائز کو مکروہ، حرام کو حلال بلکہ مستحسن اور گناہ کو ثواب کہا جاتا یا سمجھا جاتا۔ گناہوں کا ارتکاب بے شک ہوتا تھا۔ حرام سے بلاشبہ دامن آلودہ ہوتے۔ شریعت کی حدود سے بہت کچھ تجاوز کیا جاتا۔ قوانین اسلام کی خلاف ورزی حد سے گزر جاتی مگر دل ان پر شرم سار بھی ہوتے تھے، ندامت سے گردنیں جھک بھی جاتی تھیں۔ کم از کم دل اس کے معترف ہوتے تھے کہ وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عقائد کی کمزوری اور اعمال کی خرابی کے باوجود مسلمانوں کی تہذیب انھی قوائم اور ارکان پر قائم تھی جو اسلام نے تعمیر کیے تھے۔ یونان و ایران کے افکار کی درآمد نے اگرچہ بہت کچھ گمراہی پھیلائی لیکن انھیں کبھی اتنی کامیابی نہ ہوئی کہ مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ ہی کو پھیر دیتے، ان کی ذہنیت کے سانچے کو اسلام سے بالکل منحرف کر دیتے اور ان کی عقل و فکر و تمیز کی قوتوں کو یہاں تک متاثر کر دیتے کہ وہ مسلمان کی سی نظر سے دیکھنا اور مسلمان کے دماغ سے سوچنا بالکل ہی چھوڑ دیتے۔ اسی طرح تمدن و تہذیب کا ارتقاء اگرچہ بیرونی اثرات کے تحت اسلام کی متعین کی ہوئی راہوں سے بہت کچھ منحرف ہوا لیکن جن اصولوں پر اس تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ بدستور اس کی بنیاد میں موجود تھے اور کسی دوسری مخالف تہذیب و تمدن کے اصولوں نے ان کی جگہ نہ لی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا نظام بہت کچھ بگڑا مگر علوم دینی کو اس میں بہر حال ممتاز جگہ حاصل تھی اور کوئی تعلیم یافتہ مسلمان اسلامی عقائد اور احکامِ شریعت اور ملی روایات کے کم از کم ابتدائی علم سے بے بہرہ نہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی عملی زندگی پر قانونِ اسلام کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہوئیں مگر پھر بھی مسلمانوں کے جملہ معاملات پر ایک ہی قانون نافذ تھا اور وہ اسلام کا قانون تھا۔ غرض تمام خرابیوں کے باوجود مسلمانوں کے تخیلات، اخلاق، اور اعمال پر اسلام کا ایک گہرا اثر تھا۔ اس کے اصولوں پر وہ یکسوئی کے ساتھ ایمان رکھتے تھے۔ کم از کم ان کے ایمان کی سرحد میں مخالفِ اسلام اصولوں کو داخل ہونے کا موقع نہ ملتا تھا اور اخلاق و اعمال کی جو قدریں (Values) اسلام نے متعین کی تھیں اور وہ اس حد تک متغیر نہ ہوئی تھیں کہ بالکل منقلب

ہو جاتیں اور ان کے خلاف کچھ دوسری قدریں ان کی جگہ لے لیتیں۔

لیکن انیسویں صدی میں حکومت کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد جب ہماری قوم کے مترفین نے دیکھا کہ حکومت کے ساتھ جاہ و منزلت، عزت و حرمت اور مال و منال سب ہی کچھ ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں اور غلامی کی حالت میں اُن کو محفوظ رکھنے اور مافات کی تلافی کرنے کا کوئی ذریعہ بجز مغربی تہذیب اور علوم سے آراستہ ہونے کے نہیں ہے، تو ان کی روش میں ایک دوسرا تغیر ہوا جو صحیح معنوں میں محض تغیر ہی نہیں بلکہ ایک انقلاب تھا۔ تغیر کے معنی محض بدلنے کے ہیں، مگر انقلاب الٹ جانے کو کہتے ہیں اور فی الواقع ایک دوسری کروٹ میں وہ ایسے الٹ گئے کہ اُن کا قبلۂ مقصود الٹ گیا، ان کی ذہنیت الٹ گئی، اُن کی نظریں الٹ گئیں اور ان کا رُخ اسلام سے فرنگیت کی طرف پھر گیا، جو اسلام کے عین مخالف سمت میں واقع ہوئی ہے۔

یہ انقلاب جب شروع ہوا تو وہ شرمساری اور ندامت آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی جو قوانینِ اسلامی سے انحراف کرتے وقت پہلے محسوس کی جاتی تھی۔ بلکہ سرے سے یہ احساس ہی مٹنے لگا کہ شریعت کی حدود سے تجاوز کر کے وہ گناہ اور کسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شرمندگی و ندامت کی جگہ ڈھٹائی اور بے حیائی نے لے لی۔ علانیہ ہر قسم کی قانون شکنی کی جانے لگی اور شرم کے بجائے اس پر فخر کا اظہار ہونے لگا۔ مگر انقلاب کی رو اس حد پر بھی جا کر نہ رُکی۔ اب جو باتیں فرنگیت مآب لوگوں کی مجلسوں میں سنی اور دیکھی جا رہی ہیں وہ بے حیائی سے گزر کر اسلام کے خلاف صریح بغاوت کے آثار ظاہر کرتی ہیں۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک شخص جو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے الٹا اُس شخص کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس پرانے قانون کی اب تک پابندی کیے جا رہا ہے۔ گویا اب مجرم اور گنہ گار وہ نہیں ہے جو اسلامی قانون کو توڑتا ہے بلکہ وہ ہے جو اُس کی پیروی کرتا ہے۔ اب صرف نماز روزے سے پرہیز ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے۔ ترکِ صوم و صلوٰۃ کی تبلیغ کی جاتی ہے، روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، یہ امید کی جاتی ہے کہ پابندِ صوم و صلوٰۃ لوگ (خصوصاً جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں) اپنے فعل پر اُلٹے شرمندہ ہوں گے، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نماز روزے کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کی پابندی کرنا وہ عیب ہے جس پر کسی کو شرمندہ ہونا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کا کوئی عیب ظاہر ہوتا ہے تو

بڑے طنزیہ لہجے میں کہا جاتا ہے کہ آخر وہ حضرت نمازی ہیں نا، یعنی اس شخص سے عیب کے سرزد ہونے کا اصلی سبب کچھ اور نہیں بلکہ صرف وہ عمل ہے جس کو اللہ نے مانعِ فحشاء و منکر قرار دیا ہے اور جسے رسول اللہ ﷺ نے تمام اعمال سے افضل ٹھہرایا ہے۔

یہ بغاوت صرف نماز روزے تک محدود نہیں ہے بلکہ قریب قریب زندگی کے تمام معاملات میں پھیل گئی ہے۔ اب اسلامی احکام کی پابندی کو ''ملائیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ملائیت ہمارے نئے زمانے کی اصطلاح میں تنگ نظری، تاریک خیالی، جہالت، دقیانوسیت اور بے عقلی کے سب سے زیادہ شدید مرکب کا نام ہے، گویا یوں سمجھیے کہ راسخ العقیدہ اور متبعِ شریعت مسلمان کا نام ملا ہے، اور ملا وہ ہے جو تہذیب اور روشن خیالی سے کوسوں دور ہو، مہذب سوسائٹی میں کسی طرح کھپ ہی نہ سکتا ہو! یہ سو گالیوں کی ایک گالی ہے، اور اظہارِ نفرت کے لیے بہت سے الفاظ بولنے کے بجائے ہمارے ''کالے فرنگی'' اپنے تمام جذبات کو سمیٹ کر صرف ایک لفظ ''ملا'' میں بھر دیتے ہیں جو تمام عیوب کا جامع ہے۔

آج کسی قول یا فعل کی تائید میں یہ دلیل کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے۔ غیر مسلم نہیں بلکہ ایک مسلمان جو بدقسمتی سے ''تعلیم یافتہ اور روشن خیال'' ہو گیا ہے، بلا تکلف قرآن و حدیث کی سند کو رد کر دیتا اور اس پر ذرا نہیں شرماتا بلکہ توقع رکھتا ہے کہ اسلامی قانون کی سند لانے والے کو الٹا شرمندہ ہونا چاہیے، قرآن و حدیث کا مستند ہونا تو درکنار ہم نے تو یہ حال دیکھا ہے کہ جس بات کو اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کے خلاف فوراً ایک تعصب سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی بات اگر عقلی دلیل کے ساتھ پیش کی جائے یا کسی مغربی مصنف کے حوالے سے بیان کی جائے تو آمَنَّا و صَدَّقْنَا؟ لیکن اسلام کا نام آتے ہی ہمارے فرنگیت مآب ''مسلمانوں'' کے دماغوں میں اس کے خلاف طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں اور انھیں شک ہو جاتا ہے کہ اس بات میں ضرور کوئی کمزوری ہو گی گویا اب قرآن و حدیث کی سند ان لوگوں کی نظر میں کسی بات کو قوی نہیں کرتی بلکہ الٹا کمزور اور محتاجِ دلیل بنا دیتی ہے۔

چند سال پہلے یہ وبا صرف ہمارے مردوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور ہماری عورتیں اس سے محفوظ تھیں، کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''حرم'' وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر اسلام

نے حجابِ شرعی میں رکھا ہے ان میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ سینہ تو نورِ ایمانی سے منور ہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے، کم از کم وہ گود تو کفر و ضلالت اور فسادِ اخلاق و اعمال سے محفوظ رہے جس میں مسلمان کی نسل اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گزرتی ہے۔ کم از کم وہ چہار دیواری تو بیرونی اثرات سے محفوظ رہے جس میں مسلمان بچے کے سادہ دل و دماغ پر تعلیم و تربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ پس ''حرم'' دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے جس کو اس لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب اگر کبھی شکست کھا کر پسپا بھی ہو تو یہاں پناہ لے سکے۔ مگر افسوس کہ اب یہ قلعہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ فرنگیت کی وبا اب گھروں کے اندر پہنچ رہی ہے۔ ہمارے فرنگیت مآب مترفین اب اپنی خواتین کو بھی کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں تا کہ وہ بھی انہی زہریلے اثرات سے متاثر ہوں جن سے وہ خود مسموم ہو چکے ہیں۔ ہماری قوم کی لڑکیاں اب ان تعلیم گاہوں میں گمراہی اور بداعتقادی اور فسادِ اخلاق اور فرنگی تہذیب کے سبق لینے کے لیے بھیجی جا رہی ہیں جو اس سے پہلے ہمارے لڑکوں کو یہ سب کچھ سکھا کر اسلام سے باغی بنا چکی ہیں۔

یہ آخری حرکت ہمارے نزدیک اس انقلاب کی تکمیل کر دینے والی ہوگی، جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ہمارا صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ تکمیلِ انقلاب کے آثار کو یہ بدنصیب آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ اور یہ بدقسمت کان سن چکے ہیں۔ اب یہ نوبت پہنچی ہے کہ ایک مسلمان عورت قرآن و حدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے اپنی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نکلتی ہے، انگریزی ہوٹلوں میں جا کر لنچ اور ڈنر کھاتی ہے، سینما ہال میں جا کر مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے، بازاروں میں پھر کر شاپنگ کرتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قانونِ اسلامی کے خلاف یہ تمام افعال کرنے پر شرمندہ اور نادم ہونے کے بجائے فخر کے ساتھ اپنے ان کاموں کو بیان کرتی ہے۔ اور الٹا اس بے چاری عفیفہ کو قابلِ ملامت ٹھہراتی ہے جس نے پہلے تو قانونِ اسلام کی پیروی میں حجابِ شرعی کو چھوڑنے سے انکار کیا، اور جب اس کا شوہر زبردستی باہر کھینچ ہی لایا تو اس کو مردوں کے درمیان بے حجابانہ تماش بینی کرتے ہوئے شرم آئی اور اسے بازاروں کے چکر لگانا، تاج اور گرین کے مزے چکھنا، سیر گاہوں کی ہوائیں کھانا، اس چار دیواری کی بے لطفیوں کے مقابلہ میں پسند نہ آیا جس کی حدود میں رہنے کا اس کے خدا اور اس کے رسول نے حکم دیا تھا۔ اس

کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسلام کے خلاف بغاوت کی اسپرٹ مردوں سے گزر کر عورتوں تک پہنچتی جا رہی ہے۔ اور وہ بھی اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کو نہیں بلکہ اس کی پیروی کو اس قابل سمجھنے لگی ہیں کہ ایک مسلمان عورت اس پر شرمندہ و نادم ہو! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ خدارا بتاؤ کہ پرانی دین دار خاتون کی گودوں میں پرورش پانے کے باوجود جب تمہارا یہ حال ہوا ہے تو جب تمہاری عورتیں بھی غیرتِ ایمانی سے بے گانہ اور اطاعتِ خدا و رسول کی حدود سے باہر ہو جائیں گی تو ان نسلوں کا کیا حشر ہو گا جو ان نئی فرنگیت مآب خواتین کی گودوں میں پرورش پا کر نکلیں گی؟ جو بچے آنکھ کھولتے ہی اپنے گرد و پیش فرنگیت ہی فرنگیت کے آثار دیکھیں گے، جن کی معصوم نگاہیں اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی علامت سے آشنا ہی نہ ہوں گی، جن کے کانوں میں کبھی خدا اور رسول کی باتیں پڑیں گی ہی نہیں، جن کے دل و دماغ کی لوحِ سادہ پر ابتدا ہی سے فرنگیت کے نقوش ثبت ہو جائیں گے، کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے جذبات و خیالات، اخلاق، اعمال، غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں گے؟

جرم کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے مگر اس کو جرم سمجھے اور اس پر شرمندہ ہو۔ اس قسم کا جرم محض اپنی حیثیت کے لحاظ سے سزا کا مستوجب ہوتا ہے بلکہ توبہ اور اظہار ندامت سے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ایسا جرم صرف انسان کی کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔

جرم کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان جرم کرے اور اس کو عیب کے بجائے خوبی سمجھے اور فخر کے ساتھ اس کا علانیہ اظہار کرے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس شخص کے دل میں اس قانون کا کوئی احترام نہیں ہے جو اس فعل کو جرم قرار دیتا ہے۔

جرم کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف ایک قانون کے خلاف جرم کا ارتکاب کرے بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے قانون کے لحاظ سے اس جرم کو جائز اور عین صواب سمجھے اور جو قانون اس فعل کو جرم ٹھیراتا ہے اس کا مذاق اڑائے اور اس کی پیروی کرنے والوں کو خطا کار سمجھے۔ ایسا شخص صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی تحقیر کرتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہر شخص جس میں تھوڑی سی عقلِ سلیم بھی ہو گی یہ تسلیم کرے گا کہ جب انسان اس آخری مرتبہ پر پہنچ جائے تو وہ اس قانون کی حدود میں نہیں رہ سکتا جس کے خلاف اس نے علانیہ بغاوت

کی ہے۔ مگر کس قدر مردود ہے وہ شیطان جو تم کو یقین دلاتا ہے کہ تم اسلامی قانون کی تحقیر کر کے، اس کا مذاق اڑا کر، اس کی پیروی کو عیب ٹھہرا کر اور اس کی خلاف ورزی کو صواب قرار دے کر بھی مسلمان رہ سکتے ہو۔ ایک طرف تو تمہارا یہ حال ہے کہ خدا اور رسول جس کو اچھا کہیں اس کو تم برا کہو، وہ جس کو برا کہیں اس کو تم اچھا کہو، وہ جس کو گناہ ٹھہرائیں اس کو تم صواب قرار دو، وہ جس کو صواب ٹھہرائیں اس کو تم گناہ سمجھو، وہ جو حکم دیں اس کا تم مذاق اڑاؤ، وہ جو قانون بنائیں اس کی خلاف ورزی پر شرمانے کے بجائے تم الٹا اس شخص کو شرمانے کی کوشش کرو جو اُن کے قانون کی پیروی کرتا ہے۔ دوسری طرف تمہارا یہ دعویٰ کہ تم خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی عظمت تمہارے دل میں ہے اور ان کے پسندیدہ دین یعنی اسلام کے تم پیرو ہو۔ کیا کوئی صاحبِ عقل انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ اس طرزِ عمل کے ساتھ یہ دعویٰ صحیح ہے؟

اگر ایمان کے ساتھ انکار جمع ہو سکتا ہے، اگر تعظیم کے ساتھ تحقیر جمع ہو سکتی ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ کسی کا احترام بھی دل میں ہو اور اس کا مذاق بھی اڑایا جائے، اگر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ خلاف ورزی پر فخر کرنے والا اور پیروی کو ملامت کے قابل سمجھنے والا بھی پیرو اور مطیع ہو، تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ بغاوت ہی عین اطاعت ہے، اور تحقیر ہی عینِ تعظیم ہے، اور انکار ہی کا نام ایمان ہے۔ جو تمہیں ٹھوکر مارتا ہے وہی دراصل تمہاری تعظیم کرتا ہے، جو مذاق اڑاتا ہے وہی دراصل تمہارا احترام کرتا ہے اور جو تمہیں جھوٹا کہتا ہے وہی دراصل تمہاری تصدیق کرنے والا ہے۔

اسلام بجز اطاعت کے اور کسی چیز کا نام نہیں ہے اور حقیقی اطاعت ایمان کے بغیر متحقق نہیں ہوتی اور ایمان کا اولین اقتضا یہ ہے کہ جب خدا اور رسول کا حکم پہنچے تو اس کی گردن جھک جائے اور وہ اس کے مقابلے میں سر نہ اٹھا سکے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ (النور: ۵۱)

”مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

پھر یہ گردن جھکانا بھی بہ کراہت نہیں بہ طوع و رغبت ہونا چاہیے، حتّٰی کہ حکم خدا اور رسول

کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی اور ناراضی چھپی ہوئی نہ ہو۔ جس شخص کی گردن محض ظاہر میں جھک جائے مگر دل میں اس کے خلاف تنگی محسوس کر رہا ہو وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ ... فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (النسآء: ۶۱، ۶۵)

”اور جب اُن سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو کہ منافقین تمہاری طرف آتے ہوئے جی چراتے ہیں۔...پس قسم ہے تیرے پروردگار کی ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سرِ تسلیم خم کر دیں۔“

لیکن جو شخص علانیہ حکم ماننے سے انکار کر دے اور خدا و رسول کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی پیروی کرے اور انہی قوانین کو درست اور حق سمجھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے خدا اور رسول کے قانون کا مذاق اڑائے اور اس کی اطاعت کو عیب ٹھہرائے تو وہ کسی طرح بھی مومن نہیں ہو سکتا خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور مسلمانوں کے نام سے موسوم ہو اور مردم شماری میں اس کو مسلمان لکھا گیا ہو۔ انسان گناہ کر کے مومن رہ سکتا ہے بشرطیکہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اس پر نادم ہو اور اس قانون کو تسلیم کرے جس کے خلاف محض اپنی فطری کمزوری سے اُس نے ایک فعل کا ارتکاب کیا ہے، لیکن جب گناہ کے ساتھ بے شرمی اور ڈھٹائی بھی ہو اور اس پر فخر بھی کیا جائے اور اس کو صواب ٹھہرا کر اس شخص کو ملامت بھی کی جائے جو اس کا ارتکاب نہیں کرتا تو خدا کی قسم ایسے گناہ کے ساتھ ایمان کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبے میں داخل ہونے سے پہلے ہی آدمی کو قطعی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے یا اسلام سے نکل کر اس قانون کی اطاعت میں داخل ہو جانا پسند کرتا ہے جس کی پیروی میں اس کو شرحِ صدر حاصل ہو رہا ہے۔

خدا کے فضل سے ابھی تک مسلمانوں کے عوام اس فرنگیت اور ملحدانہ بغاوت کی رَو سے محفوظ ہیں۔ ابھی تک ان کے دلوں میں خدا اور رسول کے احکام کا احترام باقی ہے اور قوانینِ اسلامی کی پابندی تھوڑی بہت انہی میں نظر آتی ہے۔ لیکن خواص کی روش جس طرح پہلے ان کے اخلاق اور معاملات پر اثر انداز ہو چکی ہے اسی طرح اندیشہ ہے کہ نئی روش کہیں اُن کے ایمان پر رفتہ رفتہ اپنا مہلک اثر نہ ڈال دے۔ عامۂ مسلمین میں جس رفتار کے ساتھ ترکِ صوم وصلوٰۃ، منکرات ومنہیات کا ارتکاب، فرنگی اطوار کی تقلید کا شوق اور فرنگی تہذیب کو خوش نما بنا کر دکھانے والے کھیل تماشوں کی طرف میلان بڑھ رہا ہے وہ دراصل اس آنے والے خطرے کا الارم ہے۔ اگر ہمارے مترفین کے خیالات کی اصلاح نہ ہوئی اور اسلام کی صراطِ مستقیم سے ان کا انحراف اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ساری قوم اس ضلالت میں مبتلا ہو جائے گی اور اللہ کی یہ سنت پوری ہو کر رہے گی: وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ (بنی اسرائیل:۱۶) ’’جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب، عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔‘‘

(ترجمان القرآن، ذی القعدہ ۵۳ھ، فروری ۱۹۳۵)

اجتماعی فساد

قرآن مجید میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے کہ کسی قوم کو خواہ مخواہ برباد کر دے درآں حالیکہ وہ نیکوکار ہو:

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ (ہود:۱۱۷)

’’اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم سے تباہ کر دے حالاں کہ اُس کے باشندے نیک عمل کرنے والے ہوں۔‘‘

ہلاک و برباد کر دینے سے مراد صرف یہی نہیں کہ بستیوں کے طبقے الٹ دیے جائیں اور آبادیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قوموں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے، ان کی اجتماعی قوت توڑ دی جائے اور ان کو محکوم ومغلوب اور ذلیل وخوار کر دیا جائے۔ قاعدۂ مذکورہ کی بنا پر بربادی اور ہلاکت کی جملہ اقسام میں سے کوئی قسم بھی کسی قوم پر نازل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خیر وصلاح کے راستے کو چھوڑ کر شر وفساد اور سرکشی ونافرمانی کے طریقوں پر نہ چلنے لگے اور اس طرح خود اپنے اوپر ظلم نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر جہاں کہیں کسی قوم کو مبتلائے عذاب کرنے کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس کا جرم بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ ان کی اپنی ہی شامتِ اعمال ہے جو ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو خراب کرتی ہے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ... وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ (العنکبوت:۴۰)

”ہر ایک کو ہم نے اس کے قصور ہی پر پکڑا... اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔“

دوسری بات جو اس قاعدے سے نکلتی ہے یہ ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے۔ یعنی اعتقاد اور عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں تو خواہ افراد علیحدہ علیحدہ کتنے ہی خراب ہوں قوم بحیثیت مجموعی سنبھلی رہتی ہے اور کوئی فتنۂ عام برپا نہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو۔ مگر جب اعتقاد اور عمل کی خرابیاں افراد سے گزر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھیلنے اور پھولنے کا موقع ملنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت ایسی قوم سے پھر جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ کا غضب اس پر بھڑک اٹھتا ہے اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں اس کی بکثرت مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

قومِ نوحؑ کو اس وقت برباد کیا گیا جب اعتقادِ عمل کی خرابیاں اُن کے اندر جڑ پکڑ گئیں اور زمین میں پھیلنے لگیں اور یہ امید ہی باقی نہ رہی کہ اس شجرِ خبیث سے کبھی کوئی اچھا پھل پیدا ہوگا۔ آخر کار مجبور ہو کر حضرتِ نوحؑ نے بارگاہِ ربُّ العزت میں عرض کیا کہ:

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ (نوح: ۲۶، ۲۷)

”میرے رب، ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار و سخت کافر ہی پیدا ہوگا۔“

قومِ عاد کو اس وقت تباہ کیا گیا جب شر اور فساد نے ان کے دلوں میں یہاں تک گھر کر لیا کہ شریر اور مفسد اور ظالم ان کی قوم کے لیڈر اور حاکم بن گئے، اور اہلِ خیر و صلاح کے لیے نظامِ اجتماعی میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی:

وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ (ہود: ۵۹)

”اور یہ عاد ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جبار دشمن حق کا اتباع کیا۔“

قومِ لوط کو اس وقت ہلاک کیا گیا جب ان کا اخلاق شعور اتنا گندہ ہو گیا اور اُن میں بے حیائی یہاں تک بڑھ گئی کہ علانیہ مجلسوں اور بازاروں میں فواحش کا ارتکاب کیا جانے لگا اور فواحش کے فواحش ہونے کا احساس ہی باقی نہ رہا۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (العنکبوت: ۲۹)

”(لوطؑ نے کہا) کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو اور راستوں میں لوگوں کو چھیڑتے اور ستاتے ہو اور اپنی محفلوں میں بدکاریاں کرتے ہو۔“

اہلِ مدین پر اس وقت عذاب نازل ہوا جب پوری قوم خائن اور بد معاملہ اور بے ایمان ہو گئی۔ کم تولنا اور زیادہ لینا کوئی عیب نہ رہا اور قوم کا اخلاق احساس یہاں تک فنا ہو گیا کہ جب ان کو اس عیب پر ملامت کی جاتی تو شرم سے سر جھکا لینے کے بجائے وہ الٹا اس ملامت کرنے والے کو ملامت کرتے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں کوئی ایسا عیب بھی ہے جو ملامت کے قابل ہو۔ وہ بدکاریوں کو برا نہ سمجھتے بلکہ جو اِن حرکات کو برا کہتا اسی کو برسرِ غلط اور لائقِ سرزنش خیال کرتے:

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ ... قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ (ہود: ۸۵، ۹۱)

”(شعیبؑ نے کہا) اور اے میری قوم کے لوگو! انصاف کے ساتھ ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ... انھوں نے جواب دیا کہ

اے شعیبؑ! تو جو باتیں کہتا ہے اُن میں سے تو اکثر ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم تو تجھے اپنی قوم میں کم زور پاتے ہیں اور اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔"

بنی اسرائیل کو ذلّت و مسکنت اور غضب و لعنتِ الٰہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ اس وقت صادر ہوا جب انھوں نے بدی اور ظلم اور حرام خوری کی طرف لپکنا شروع کیا، ان کی قوم کے پیشوا مصلحت پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گئے، ان میں گناہوں کے ساتھ رواداری پیدا ہو گئی اور ان میں کوئی گروہ ایسا نہ رہا جو عیب کو عیب کہنے والا اور اس سے روکنے والا ہوتا:

وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (المائدہ: ۶۲، ۶۳)

"تو اِن میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حدودِ الٰہی سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ کیسی بُری حرکتیں تھیں جو وہ کرتے تھے، کیوں نہ ان کے مشائخ اور علماء نے ان کو بری باتیں اور حرام کے مال کھانے سے منع کیا؟ یہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔"

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ (المائدہ: ۷۸، ۷۹)

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اُن پر داوٗد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی اس لیے کہ انھوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے افعال سے نہ روکتے تھے۔"

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآنِ کریم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی

یا دوست یا ہمسایہ کو بُرا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا اور کہتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اُس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت کرنے سے نہ روکتا، جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایک دوسرے کا اثر پڑ گیا، اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داوٗدؑ اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان سے ان پر لعنت کی۔"

راوی کہتا ہے کہ جب حضورؐ سلسلۂ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آ کر اُٹھ بیٹھے اور فرمایا:

"قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو اور جس کو بُرا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔"

اعتقاد اور عمل کے فساد کا حال وبائی امراض کا سا ہے۔ ایک وبائی مرض ابتدا میں چند کم زور افراد پر حملہ کرتا ہے۔ اگر آب و ہوا اچھی ہو، حفظانِ صحت کی تدابیر درست ہوں، نجاستوں اور کثافتوں کو دور کرنے کا کافی انتظام ہو اور مرض سے متاثر ہونے والے مریضوں کا بروقت علاج کر دیا جائے تو مرض وبائے عام کی صورت اختیار کرنے نہیں پاتا اور عام لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن اگر طبیب غافل ہوں، حفظانِ صحت کا محکمہ بے پرواہ ہو، صفائی کے منتظم نجاستوں اور کثافتوں کے روادار ہو جائیں تو رفتہ رفتہ مرض کے جراثیم فضا میں پھیلنے لگتے ہیں، اور آب و ہوا میں سرایت کر کے اس کو اتنا خراب کر دیتے ہیں کہ وہ صحت کے بجائے مرض کے لیے سازگار ہو جاتی ہے۔ آخر کار جب بستی کے عام افراد کو ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان غرض کوئی چیز بھی گندگی اور سمیت سے پاک نہیں ملتی تو اُن کی قوتِ حیات جواب دینے لگتی ہے اور ساری کی ساری آبادی وبائے عام میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر قوی سے قوی افراد کے لیے بھی اپنے آپ کو مرض سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود طبیب اور صفائی کے منتظم اور صحتِ عامہ کے محافظ تک بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہلاکت سے محفوظ نہیں رہتے جو اپنی حد تک حفظانِ صحت کی جملہ

تدبیریں اختیار کرتے ہیں اور دوائیں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ ہوا کی سمیت، پانی کی گندگی، وسائلِ غذا کی خرابی، اور زمین کی کثافت کا اُن کے پاس کیا علاج ہوسکتا ہے۔

اسی پر اخلاق و اعمال کے فساد اور اعتقاد کی گمراہیوں کو بھی قیاس کر لیجیے۔ علماء قوم کے طبیب ہیں۔ حکام اور اہلِ دولت صفائی اور حفظانِ صحت کے ذمہ دار ہیں۔ قوم کی غیرتِ ایمانی اور جماعت کا حاسۂ اخلاق بہ منزل قوتِ حیات (Vitality) ہے۔ اجتماعی ماحول کی حیثیت وہی ہے جو ہوا، پانی، غذا اور لباس و مکان کی ہے اور حیاتِ قومی میں دین و اخلاق کے اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہی مقام ہے جو صحتِ جسمانی کے اعتبار سے صفائی و حفظانِ صحت کی تدابیر کا ہے۔ جب علماء اور اولی الامر اپنے اصل فرض یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں اور شر و فساد کے ساتھ رواداری برتنے لگتے ہیں تو گمراہی اور بداخلاقی قوم کے افراد میں پھیلنی شروع ہوجاتی ہے اور قوم کی غیرتِ ایمانی ضعیف ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا اجتماعی ماحول فاسد ہوجاتا ہے۔ قومی زندگی کی فضا خیر و صلاح کے لیے نامساعد اور شر و فساد کے لیے سازگار ہوجاتی ہے، لوگ نیکی سے بھاگتے ہیں اور بدی سے نفرت کرنے کے بجائے اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، اخلاقی قدریں الٹ جاتی ہیں، عیب ہنر بن جاتے ہیں اور ہنر عیب، اس وقت گمراہیاں اور بداخلاقیاں خوب پھلتی پھولتی ہیں اور بھلائی کا کوئی بیج برگ و بار لانے کے قابل نہیں رہتا، زمین، ہوا اور پانی سب اس کو پرورش کرنے سے انکار کردیتے ہیں کیوں کہ ان کی ساری قوتیں اشجارِ خبیثہ کو نشو و نما دینے کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہوجاتا ہے تو پھر وہ عذابِ الٰہی کی مستحق ہوجاتی ہے اور اس پر ایسی عام تباہی نازل ہوتی ہے جس سے کوئی نہیں بچتا خواہ وہ خانقاہوں میں بیٹھا ہوا رات دن عبادت کر رہا ہو۔ اسی کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال:۲۵)

"بچو اس فتنہ سے جو صرف انھی لوگوں کو مبتلائے مصیبت نہ کرے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے۔"

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے نہ ٹھہرنے دو۔ کیوں کہ اگر تم بری سے رواداری کرو گے اور اس کو پھیلنے

دو گے تو اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور بُرے سب آجائیں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ:

ان اللّٰہ لا یُعذب العامة بعمل خاصة حتیٰ یروا المنکر بین ظهرانیهم قادرون علیٰ ان ینکروه فلا ینکروه فاذا فعلوا ذالک عذاب اللّٰه الخاصة والعامة.

"اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا مگر جب وہ اپنے سامنے بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے پر قدرت رکھنے کے باجود اس کو نہ روکیں تو اللہ خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کردیتا ہے۔"

قوم کی اخلاقی اور دینی صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ہر فرد میں غیرتِ ایمانی اور حاسۂ اخلاق موجود ہو، جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع لفظ "حیا" سے تعبیر فرمایا ہے۔ حیا دراصل ایمان کا ایک جز ہے، جیسا کہ حضوؐر نے فرمایا ہے: انّ الحیاء من الایمان۔ بلکہ ایک موقع پر جب حضوؐر سے عرض کیا گیا کہ حیا دین کا ایک جز ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا بل ھو الذین کلّہ یعنی وہ پورا دین ہے۔

حیا سے مراد یہ ہے کہ بدی اور معصیت سے نفس میں طبعی طور پر انقباض پیدا ہو اور دل اس سے نفرت کرے۔ جس شخص میں یہ صفت موجود ہوگی وہ نہ صرف قبائح سے اجتناب کرے گا بلکہ دوسروں میں بھی اس کو برداشت نہ کرسکے گا، وہ برائیوں کو دیکھنے کا روادار نہ ہوگا۔ ظلم اور معصیت سے مصالحت کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ جب اس کے قبائح کا ارتکاب کیا جائے گا تو اس کی غیرتِ ایمانی جوش میں آجائے گی اور وہ اُس کو ہاتھ سے یا زبان سے مٹانے کی کوشش کرے گا، یا کم از کم اس کا دل اس خواہش سے بے چین ہوجائے گا کہ اس برائی کو مٹادے:

من رأ منکم منکرا فلیغیره بیدهٖ فان لم یستطع فبلسانهٖ فان لم یستطع فبقلبه و ذالک اضعف الایمان۔

"تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹادے اور اگر ایسا نہ کرسکتا ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو دل سے اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔"

جس قوم کے افراد میں عام طور پر یہ صفت موجود ہوگی اس کا دین محفوظ رہے گا اور اس کا اخلاقی معیار کبھی نہ گر سکے گا، کیوں کہ اس کا ہر فرد دوسرے کے لیے محتسب اور نگراں ہوگا اور عقیدہ وعمل کے فساد کو اس میں داخل ہونے کے لیے کوئی راہ نہ مل سکے گی۔

قرآن مجید کا مقصد دراصل ایسی ہی ایک آئیڈیل سوسائٹی بنانا ہے، جس کا ہر فرد اپنے قلبی رجحان اور اپنی فطری غیرت وحیا اور خالص اپنے ضمیر کی تحریک پر احتساب اور نگرانی کا فرض انجام دے اور کسی اُجرت کے بغیر خدائی فوج دار بنا پھرے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ:۱۴۳)

"اور اس طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر نگراں رہو، اور رسول تم پر نگراں رہے۔"

اسی لیے بار بار مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا تمہارا قومی خاصہ ہے، جو ہر مومن مرد اور عورت میں متحقق ہونا چاہیے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم کرتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ:۷۱)

"مومن مرد اور عورت ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ نیکی کا حکم کرتے اور بدی سے روکتے ہیں۔"

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (التوبہ:۱۱۲)

"وہ نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج:۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم اگر زمین میں حکومت بخشیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔"

اگر مسلمانوں کا یہ حال ہو تو ان کی مثال اس بستی کی سی ہوگی جس کے ہر باشندے میں صفائی اور حفظانِ صحت کا احساس ہو۔ وہ نہ صرف اپنے جسم اور اپنے گھر کو پاک صاف رکھے، بلکہ بستی میں جہاں کہیں غلاظت اور نجاست دیکھے اس کو دور کردے اور کسی جگہ گندگی اور کثافت کے رہنے کا روادار نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسی بستی کی آب وہوا پاک اور صاف رہے گی۔ اس میں امراض کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں گے اور اگر شاذ ونادر کوئی شخص کم زور اور مریض الطبع ہوگا تو اس کا بروقت علاج ہوجائے گا، یا کم از کم اس کی بیماری محض شخصی بیماری ہوگی۔ دوسروں تک متعدی ہوکر وبائے عام کی صورت نہ اختیار کرسکے گی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی قوم اس بلند درجہ پر نہ رہ سکے تو سوسائٹی کی دینی واخلاقی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم ایک ایسا گروہ تو ان میں ضرور موجود رہنا چاہیے جو ہر وقت اس خدمت پر مستعد رہے اور اعتقاد کی گندگیوں اور اخلاق واعمال کی نجاستوں کو دور کرتا رہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۰۴)

"تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلانے والی ہو۔ نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔"

یہ جماعت علماء اور اولوالامر کی جماعت ہے۔ جس کا امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں منہمک رہنا اتنا ضروری ہے جتنا شہر کے محکمۂ صفائی وحفظانِ صحت کا اپنے فرائض میں مستعد رہنا ضروری ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے فرض سے غافل ہوجائیں اور قوم میں ایک جماعت بھی ایسی باقی

نہ رہے جو خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے والی اور منکرات سے روکنے والی ہو تو دین و اخلاق کے اعتبار سے قوم کی تباہی اسی طرح یقینی ہے جس طرح جسم و جان کے اعتبار سے اُس بستی کی ہلاکت یقینی ہے جس میں صفائی و حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگلی قوموں پر جو تباہیاں نازل ہوئی ہیں وہ اسی لیے ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی گروہ بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جو ان کو برائیوں سے روکتا اور خیر و صلاح پر قائم رکھنے کی کوشش کرتا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ (ہود:۱۱۵)

"تم سے پہلی قوموں میں کم از کم ایسے اہلِ فضل ہی کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد سے روکنے والے ہوتے۔ بجز چند آدمیوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا کر نکال دیا۔"

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ (المائدہ:۶۳)

"کیوں نہ اُن کے علماء اور مشائخ نے اُن کو بُری باتیں کہنے اور حرام خوری کرنے سے باز رکھا؟"

پس قوم کے علماء و مشائخ اور اولوالامر کی ذمہ داری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ صرف اپنے ہی اعمال کے جواب دہ نہیں بلکہ پوری قوم کے اعمال کی جواب دہی بھی ایک بڑی حد تک ان پر عائد ہوتی ہے۔ ظالم، جفاکار اور عیش پسند اُمراء اور ایسے امراء کی خوشامدیں کرنے والے علماء و مشائخ کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے ان کا جو کچھ حشر خدا کے ہاں ہوگا اس کے ذکر کی حاجت نہیں۔ لیکن جو امراء اور علماء و مشائخ اپنے محلوں اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی داد دے رہے ہیں وہ بھی خدا کے ہاں جواب دہی سے بچ نہیں سکتے۔ کیوں کہ جب اُن کی قوم پر ہر طرف سے گم راہی اور بداخلاقی کے طوفان اُمڈے چلے آ رہے ہوں تو ان کا کام یہ نہیں ہے کہ گوشوں میں سر جھکائے بیٹھے رہیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ مردِ میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور اور اثر اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس کو کام میں لا کر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کرنے کی ذمہ داری بلاشبہ ان پر نہیں مگر اس کے مقابلہ میں

اپنی پوری امکانی قوت صرف کر دینے کی ذمہ داری تو یقیناً ان پر ہے، اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو اُن کی عبادت و ریاضت اور شخصی پرہیزگاری ان کو یوم الفصل کی جواب دہی سے بری نہ کر دے گی۔ آپ محکمۂ صفائی کے افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہو اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدبیر کر رہا ہو، عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابلِ اعتراض نہیں لیکن محکمۂ صفائی کا افسر ایسا کرے تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

(ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۵۳ھ، مارچ ۱۹۳۵ء)

ایمان اور اطاعت

اجتماعی نظم خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو اور کسی غرض و غایت کے لیے ہو، اپنے قیام و استحکام اور اپنی کامیابی کے لیے دو چیزوں کا ہمیشہ محتاج ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جن اصولوں پر کسی جماعت کی تنظیم کی گئی ہو وہ اس پوری جماعت اور اس کے ہر فرد کے دل و دماغ میں خوب بیٹھے ہوئے ہوں اور جماعت کا ہر فرد ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ جماعت میں سمع و طاعت کا مادہ موجود ہو۔ یعنی اس نے جس کسی کو اپنا صاحبِ امر تسلیم کیا ہو اس کے احکام کی پوری طرح اطاعت کرے، اس کے مقرر کیے ہوئے ضوابط کی سختی کے ساتھ پابند رہے اور اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے، یہ ہر نظام کی کامیابی کے لیے ناگزیر شرطیں ہیں۔ کوئی نظام خواہ وہ نظامِ عسکری ہو، یا نظامِ عمرانی، یا نظامِ دینی، ان دونوں شرطوں کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے، اور نہ اپنے مقصد کو پہنچ سکتا ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ جایئے آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ کوئی تحریک تمرد لے، منافق، نافرمان اور غیر مطیع پیرووں کے ساتھ کامیاب ہوئی ہو، یا بہ درجۂ آخر چل سکی ہو۔ تاریخ کے صفحات میں بھی جانے کی ضرورت نہیں، خود اپنے گرد و پیش کی دنیا ہی پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آپ اس فوج کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جو اپنی سلطنت کے وفادار اور اپنے سالارِ لشکر کی مطیع فرمان نہ رہے، جس کے سپاہی فوجی ضوابط کی پابندی سے انکار کریں، پریڈ کا بگل بجے تو کوئی سپاہی اپنی جگہ سے نہ ہلے، کمانڈر کوئی حکم دے تو سپاہی سنی ان سنی کر جائیں؟ کیا آپ سپاہیوں کے ایسے انبوہ کو "فوج" کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ امید کر سکتے ہیں کہ ایسی بن سری فوج کسی جنگ میں کامیاب ہوگی؟ آپ اس سلطنت کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں جس

کی رعایا میں قانون کا احترام باقی نہ رہے۔ جس کے قوانین علی الاعلان توڑے جائیں، جس کے محکموں میں کسی قسم کا ضبط و نظم باقی نہ رہے، جس کے کارکن اپنے مقتدرِ اعلیٰ کے احکام بجالانا چھوڑ دیں؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی رعایا اور ایسے عمال کے ساتھ کوئی سلطنت دنیا میں قائم رہ سکتی ہے؟ آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں۔ ہٹلر اور مسولینی نے جو عظیم الشان طاقت حاصل کی ہے تمام دنیا اس کی معترف ہے، مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کی کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟ وہی دو یعنی ایمان اور اطاعتِ امر، نازی اور فاشسٹ جماعتیں ہرگز اتنی طاقت ور اور اتنی کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں۔

یہ قاعدۂ کلیہ ایسا ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔ ایمان اور اطاعت دراصل نظم کی جان ہے۔ ایمان جتنا راسخ ہے اور اطاعت جتنی کامل ہوگی، نظم اتنا ہی مضبوط اور طاقت ور ہوگا اور اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا بہ خلاف اس کے ایمان میں جتنا ضعف اور اطاعت سے جتنا انحراف ہوگا اسی قدر نظم کمزور ہوگا۔ اور اسی نسبت سے وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی جماعت میں نفاق، بدعقیدگی، انتشارِ خیال، خودسری، نافرمانی اور بے ضابطگی کے امراض پھیل جائیں اور پھر بھی اس میں نظم باقی رہے اور کسی شعبۂ حیات میں ترقی کی طرف رواں نظر آئے۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ دنیا جب سے آباد ہوئی ہے اس وقت سے آج تک ان دونوں کا کبھی اجتماع نہیں ہوا اور اگر قانونِ فطرت اٹل ہے تو اس قانون کی دفعہ بھی اٹل ہے کہ دونوں حالتیں کبھی یکجا جمع نہیں ہو سکتیں۔

اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالیے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ نفاق اور بدعقیدگی کی کون سی قسم ایسی ہے جس کا انسان تصور کر سکتا ہو اور وہ مسلمانوں میں موجود نہ ہو۔ اسلامی جماعت کے نظام میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناواقف ہیں اور اب تک جاہلیت کے عقائد پر جمے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جو اسلام کے اساسی اصولوں میں شک رکھتے ہیں اور شکوک کی علانیہ تبلیغ کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو علی الاعلان انکار کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اسلامی عقائد اور شعائر کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو علانیہ مذہب اور مذہبیت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کی

تعلیمات کے مقابلہ میں کفار سے حاصل کیے ہوئے تخیلات وافکار کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے قانون پر جاہلیت کے رسوم یا کفار کے قوانین کو مقدم رکھتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول کے دشمنوں کو خوش کرنے کے لیے شعائرِ اسلام کی توہین کرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدہ کی خاطر اسلام کے مصالح کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں، جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کا ساتھ دیتے ہیں، اسلامی اغراض کے خلاف کفار کی خدمت کرتے ہیں اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ان کو اتنا بھی عزیز نہیں کہ اس کی خاطر ایک بال برابر بھی نقصان گوارا کرسکیں۔ راسخ الایمان اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک نہایت قلیل جماعت کو چھوڑ کر اس قوم کی بہت بڑی اکثریت اسی قسم کے منافق اور فاسد العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔

یہ تو تھا ایمان کا حال، اب سمع وطاعت کا حال دیکھیے۔ آپ مسلمانوں کی کسی بستی میں چلے جائیے، آپ کو عجیب نقشہ نظر آئے گا۔ اذان ہوتی ہے مگر بہت سے مسلمان یہ بھی محسوس نہیں کرتے کہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس چیز کے لیے بلا رہا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے مگر ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی مسلمان اپنے کاروبار یا لہو لعب کو یادِ خدا کے لیے نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا زمانہ آتا ہے تو بعض مسلمانوں کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ بہت سے مسلمان علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور اپنے روزہ نہ رکھنے پر ذرّہ برابر نہیں شرماتے بلکہ بس چلتا ہے تو اُلٹا روزہ رکھنے والوں کو شرم دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ روزہ رکھتے بھی ہیں اُن میں سے بھی بہت کم ہیں جو احساسِ فرض کے ساتھ ایسا کرتے ہیں، ورنہ کوئی محض رسم ادا کرتا ہے، کوئی صحت کے لیے مفید سمجھ کر رکھ لیتا ہے اور روزہ رکھ کر وہ سب کچھ کرتا ہے جس سے خدا اور اُس کے رسول نے منع کیا ہے۔ زکوٰۃ اور حج کی پابندی اس سے بھی کم تر ہے، حلال اور حرام، پاک اور ناپاک کا امتیاز تو مسلمانوں میں سے اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے، وہ کون سی چیز ہے جس کو خدا اور رسول نے منع کیا ہو اور مسلمان اس کو اپنے لیے مباح نہ کر لیتے ہوں۔ وہ کون سی حد ہے جو خدا اور رسول نے قائم کیا ہو اور مسلمان اس کو نہ توڑتے ہوں۔ اگر مردم شماری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان کروڑوں ہیں مگر ان کروڑوں میں دیکھیے کہ کتنے فی صدی نہیں، کتنے فی ہزار بلکہ کتنے فی لاکھ خدا اور رسول کے احکام کو ماننے والے اور اسلامی ضوابط کی پابندی کرنے والے ہیں۔

جس قوم میں منافقت اور ضعفِ اعتقاد کا مرض عام ہوجائے، جس قوم میں فرض کا احساس باقی نہ رہے، جس قوم سے سمع وطاعت اور ضابطہ کی پابندی اٹھ جائے، اس کا جو کچھ انجام ہونا چاہیے ٹھیک وہی انجام مسلمانوں کا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج مسلمان تمام دنیا میں محکوم و مغلوب ہیں، جہاں ان کی اپنی حکومت موجود ہے وہاں بھی وہ غیروں کے اخلاقی، ذہنی اور مادّی تسلط سے آزاد نہیں ہیں۔ جہالت، مفلسی اور خستہ حالی میں وہ ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی پستی نے ان کو حد درجہ ذلیل کردیا ہے، امانت، صداقت اور وفائے عہد کی صفات جن کے لیے وہ کبھی دنیا میں ممتاز تھے، اب اُن سے دوسروں کی طرف منتقل ہوچکی ہیں اور ان کی جگہ خیانت، جھوٹ، دغا اور بدمعاملگی نے لے لی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری اور پاکیزگیِ اخلاق سے وہ عاری ہوتے جاتے ہیں۔ جماعتی غیرت وحمیت روز بروز اُن سے مفقود ہوتی جاتی ہے۔ کسی قسم کا نظم ان میں باقی نہیں رہا ہے۔ آپس میں ان کے دل پھٹے چلے جاتے ہیں اور کسی مشترک غرض کے لیے مل کر کام کرنے کی صلاحیت اُن میں باقی نہیں رہی ہے۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ذلیل ہوگئے ہیں، قوموں پر سے اُن کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور اُٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی قومی اور اجتماعی قوت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ ان کی قومی تہذیب وشائستگی فنا ہوتی چلی جارہی ہے۔ اپنے حقوق کی مدافعت اور اپنے شرفِ قومی کی حفاظت سے وہ عاجز ہوتے جارہے ہیں۔ باوجودیکہ تعلیم اُن میں بڑھ رہی ہے، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اور یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ بنگلوں میں رہنے والے، موٹروں پر چڑھنے والے، سوٹ پہننے والے، بڑے بڑے ناموں سے یاد کیے جانے والے، بڑی سرکاروں میں سرفرازیاں پانے والے ان میں روز بروز بڑھتے جارہے ہیں، لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے وہ پہلے متصف تھے اب اُن سے عاری ہیں، اپنی ہمسایہ قوموں پر ان کی جو ساکھ اور دھاک پہلے تھی وہ اب نہیں ہے، جو عزت وہ پہلے رکھتے تھے وہ اب نہیں رکھتے۔ جو اجتماعی قوت وطاقت ان میں پہلے تھی، وہ اب نہیں ہے، اور آئندہ اس سے بھی زیادہ خراب آثار نظر آرہے ہیں۔

کوئی مذہب یا تہذیب ہو، یا کسی قوم کا نظامِ جماعت ہو اس کے متعلق دو ہی طرزِ عمل انسان کے لیے معقول ہوسکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں داخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے قانون وضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے اور اگر ایسا نہیں کرسکتا تو اس

میں داخل نہ ہویا ہو چکا ہے تو بالاعلان اس میں سے نکل جائے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرزِ عمل نہیں ہوسکتا کہ تم ایک نظام میں شریک بھی ہو، اس کے ایک جزو بن کر بھی رہو، اس نظام کے تابع ہونے کا دعویٰ بھی کرو اور پھر اس کے اساسی اصولوں سے کلاً یا جزءً انحراف بھی کرو، اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو، اپنے آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی سے مستثنیٰ بھی کرلو۔ اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں، خلوصِ نیت سے تمہارے دل خالی ہوجائیں، تمہارے قلوب میں کسی مقصد کے لیے گرم جوشی اور رسوخِ عزم نہ پیدا ہوسکے، فرض شناسی، اتباعِ قانون اور باضابطگی کے اوصاف سے تم عاری ہوجاؤ اور تم میں یہ صلاحیت باقی نہ رہے کہ کسی نظامِ جماعت کے کارآمد رکن بن سکو، ان کمزوریوں اور بدترین عیوب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہوگے اس کے لیے لعنت بن جاؤ گے۔ جس نظام میں بھی داخل ہوگے اسے درہم برہم کردو گے۔ جس تہذیب کے جسم میں داخل ہوگے اس کے لیے جذام کے جراثیم ثابت ہوگے۔ جس مذہب کے پیرو بنو گے اس کو مسخ کرکے چھوڑو گے۔ ان اوصاف کے ساتھ تمہارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمہارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پیروی کرسکو اسی میں جا شامل ہو۔ منافق مسلمان سے تو وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اس کے ضوابط کی پابندی کریں۔

جو لوگ مسلمانوں کے مرض کا علاج تعلیم مغربی اور تہذیب جدید اور اقتصادی حالات کی اصلاح اور سیاسی حقوق کے حصول کو سمجھتے تھے وہ غلطی پر تھے اور اب بھی جو ایسا سمجھ رہے ہیں وہ غلطی کررہے ہیں۔ بہ خدا اگر مسلمانوں کا ہر فرد ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی اور بیرسٹر ہوجائے، دولت و ثروت سے مالا مال ہو، مغربی فیشن سے از سر تا بقدم آراستہ ہو، اور حکومت کے تمام عہدے اور کونسلوں کی تمام نشستیں مسلمانوں ہی کو مل جائیں، مگر ان کے دل میں نفاق کا مرض ہو، وہ فرض کو فرض نہ سمجھیں، وہ نافرمانی، سرکشی اور بے ضابطگی کے خوگر ہیں تو اسی پستی اور ذلت اور کمزوری میں اس وقت بھی مبتلا رہیں گے جس میں آج مبتلا ہیں۔ تعلیم، فیشن، دولت اور حکومت کوئی چیز ان کو اس گڑھے سے نہیں نکال سکتی، جس میں وہ اپنی سیرت اور اپنے اخلاق کی وجہ سے گرگئے ہیں۔ اگر ترقی کرنی ہے، اور ایک طاقت ور باعزت جماعت بننا ہے تو سب سے پہلے

مسلمانوں میں ایمان اور اطاعتِ امر کے اوصاف پیدا کرو کہ اس کے بغیر نہ تمہارے افراد میں کس بل پیدا ہوسکتا ہے، اور نہ تمہاری جماعت میں نظم پیدا ہوسکتا ہے اور نہ تمہاری اجتماعی قوت اتنی زبردست ہوسکتی ہے کہ تم دنیا میں سربلند ہوسکو۔ ایک منتشر جماعت جس کے افراد کی اخلاقی اور معنوی حالت خراب ہو کبھی اس قابل نہیں ہوسکتی کہ دنیا کی منظم اور مضبوط قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے۔ پھوس کے پولوں کا انبار خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کبھی قلعہ نہیں بن سکتا۔

اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن وہ ہیں جو مسلمانوں میں بدعقیدگی اور نافرمانی پھیلا رہے ہیں۔ یہ منافقوں کی سب سے زیادہ بری قسم ہے جس کا وجود مسلمانوں کے لیے حربی کافروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیوں کہ یہ باہر سے حملہ نہیں کرتے بلکہ گھر میں بیٹھ کر اندر ہی اندر ڈائنامائٹ بچھاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو دین اور دنیا دونوں میں رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہیں بھی اسی طرح کافر بنانا چاہتے ہیں جس طرح وہ خود ہوگئے ہیں۔ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَآءً (النساء:۸۹) ”وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں، اسی طرح تم بھی کافر ہوجاؤ تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہوجائیں۔“ ان کے شر سے بچنے کی کم سے کم تدبیر یہ ہے کہ جو لوگ دل سے مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ اُن سے قطع تعلق کرلیں فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَآءَ (النساء:۸۹) ”ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔“ ورنہ قرآن نے تو اُن کی آخری سزا یہ قرار دی ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ (النساء:۸۹) ”اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤں انھیں پکڑلو اور قتل کرو۔“

(ترجمان القرآن، رمضان ۱۳۵۳ھ، دسمبر ۱۹۳۴ء)

مسلمان کا حقیقی مفہوم

ہماری روزمرّہ کی بول چال میں بعض ایسے الفاظ اور فقرے رائج ہیں جن کو بولتا ہر شخص ہے، مگر سمجھتے بہت کم ہیں۔ کثرتِ استعمال نے اُن کا ایک اجمالی مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے۔ بولنے والا جب ان الفاظ کو زبان سے نکالتا ہے تو وہی مفہوم مراد لیتا ہے۔ اور سننے والا جب انھیں سنتا ہے تو اسی مفہوم کو سمجھتا ہے۔ لیکن وہ گہرے معانی جن کے لیے واضع نے ان الفاظ کو وضع کیا تھا، جہلاء تو درکنار اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر ”اسلام“ اور ”مسلمان“ کو لیجیے۔ کس قدر کثرت سے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں اور کتنی ہمہ گیری کے ساتھ انھوں نے ہماری زبانوں پر قبضہ کر لیا ہے؟ مگر کتنے بولنے والے ہیں جو ان کو سوچ سمجھ کر بولتے ہیں؟ اور کتنے سننے والے ہیں جو انھیں سن کر وہی مفہوم سمجھتے ہیں جس کے لیے یہ الفاظ وضع کیے گئے تھے؟ غیر مسلموں کو جانے دیجیے خود مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو ”مسلمان“ کہتے اور اپنے مذہب کو ”اسلام“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، مگر نہیں جانتے کہ ”مسلمان“ ہونے کے کیا معنیٰ ہیں اور لفظِ ”اسلام“ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ آئیے آج تھوڑا سا وقت ہم انہی الفاظ کی تشریح میں صرف کریں۔

اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اگر آپ لوگوں کے احوال پر نگاہ ڈالیں گے تو عموماً تین قسم کے لوگ آپ کو ملیں گے:

ایک قسم ان لوگوں کی جو علانیہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کے قائل ہیں، ہر معاملہ میں خود اپنی رائے پر اعتماد کرتے ہیں۔ صرف اپنی عقل کے فیصلوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور وہی طریقِ کار اختیار کرتے ہیں جو اُن کے اپنے خیال میں صحیح ہوتا ہے۔ کسی مذہب کی پیروی سے اُن کو کچھ

سروکار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو بہ ظاہر کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ مگر حقیقت میں پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد اور قوانینِ عمل کے لیے مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ خود اپنی طبیعت کے رجحان یا دلچسپی یا اغراض وحاجات کے لحاظ سے کچھ عقائد اپنے ذہن میں جما لیتے ہیں۔ عمل کے کچھ طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو اُن کے مطابق ڈھال لیں۔ گویا درحقیقت، وہ مذہب کے پیرو نہیں ہوتے بلکہ مذہب اُن کا پیرو ہوتا ہے۔

تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو خود اپنی سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ اپنی عقل کو معطل رکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرنے لگتے ہیں خواہ وہ ان کے باپ دادا ہوں، یا اُن کے ہم عصر۔

پہلا گروہ آزادی کے نام پر مرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ ان کے صحیح حدود کیا ہیں؟ فکر وعمل کی آزادی بلاشبہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو گمراہی بن جاتی ہے۔ جو شخص ہر معاملہ میں صرف اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے، ہر مسئلے میں صرف اپنی عقل کو حکم مانتا ہے، وہ دراصل اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے علم اور اس کی عقل نے دنیا بھر کے تمام امور کا احاطہ کر لیا ہے کوئی حقیقت اور مصلحت اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر منزل کی راہ ورسم سے وہ باخبر ہے۔ ہر مسلک کی پیچیدگیوں کا اُسے علم ہے، ہر رستے کی انتہا کو بھی وہ اسی طرح جانتا ہے جس طرح اس کی ابتداء کو۔ یہ علم اور ہوش مندی کا زعم درحقیقت ایک زعمِ باطل ہے اور اگر انسان صحیح معنوں میں خود اپنی عقل کو حکم بنائے تو خود عقل ہی کہہ دے گی کہ میرا اندھا مقلد مجھ کو جن صفات سے متصف سمجھتا ہے حقیقتاً میں ان سے متصف نہیں ہوں۔ مجھ کو اپنا واحد رہنما سمجھنے والا صرف میری رہنمائی میں زندگی کی راہ طے کرنے والا، ٹھوکروں، لغزشوں، گم راہیوں، اور ہلاکتوں سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی حریتِ فکر وعمل، تمدن وتہذیب کے لیے بھی مہلک ہے۔ حرّیت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر شخص وہی اعتقاد رکھے جو خود اس کے اپنے خیال میں صحیح ہو۔ اور اسی راہ پر چلے جو اس کی اپنی عقل کے مطابق درست ہو۔ تمدن وتہذیب کا اقتضا یہ ہے کہ ایک نظام تمدن میں جتنے لوگ

ہیں وہ سب چند بنیادی عقائد و افکار میں متفق ہوں اور اپنی عملی زندگی میں ان مخصوص اطوار و آداب اور قوانین کی پیروی کریں جو حیاتِ اجتماعی کی تنظیم کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں، پس حریتِ فکر و عمل اور تمدن و تہذیب میں کھلی ہوئی منافات ہے۔ حریت، افراد میں خود سری بے قیدی اور انارکی پیدا کرتی ہے۔ تمدن ان سے اتباع، پیروی اور تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جہاں کامل حریت ہوگی وہاں تمدن نہ ہوگا۔ اور جہاں تمدن ہوگا وہاں افراد کو ایک بڑی حد تک حریتِ فکر و عمل سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔

دوسرے گروہ کا حال پہلے گروہ سے زیادہ بُرا ہے۔ پہلا گروہ صرف گمراہ ہے، دوسرا گروہ اس کے ساتھ جھوٹا، منافق، دھوکہ باز اور بدطینت بھی ہے۔ اگر تاویل کی جائز حدود میں رہ کر ایک شخص اپنے مذہب اور اپنے تخیلات و رجحانات میں موافقت پیدا کر سکتا ہو تو حریتِ فکر و عمل کے ساتھ مذہب کا اتباع ممکن ہے۔ اگر انسان کے اپنے رجحانات مذہب کے خلاف ہوں اور اس کے باوجود مذہب کو صحیح اور اپنے رجحانات کو غلط سمجھتا ہو تب بھی ایک حد تک اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا کہ وہ واقعی اس مذہب کو مانتا ہے جس کی پیروی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ لیکن اگر مذہب کی واضح تعلیمات سے اس کے عقائد اور اعمال صریحاً مختلف ہوں اور وہ اپنے خیالات کو صحیح اور مذہب کی تعلیم کو غلط سمجھتا ہو اور پھر وہ اپنے آپ کو مذہب کے دائرے میں شامل رکھنے کے لیے مذہبی تعلیمات کو اپنے خیالات اور طور طریقوں کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرے تو ایسے شخص کو ہم کودَن نہیں کہیں گے کیوں کہ کودَن سے اتنے ہوشیاری کا کام کہاں بن آتا ہے۔ ہمیں مجبوراً اس کو بے ایمان کہنا پڑے گا۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ اس میں مذہب سے علانیہ بغاوت کرنے کے لیے کافی اخلاقی جرأت نہیں ہے اس لیے وہ منافقت کی راہ سے مذہب کا پیرو بنتا ہے، ورنہ کون سی چیز اس کے لیے ایک ایسے مذہب کو چھوڑ دینے میں مانع ہے جس کی تعلیمات اس کی عقل کے فیصلوں کے خلاف ہیں، اس کے حقیقی افکار و عقائد کی ضد واقع ہوئی ہیں۔ اور اسے ان طریقوں پر چلنے سے روکتی ہیں جن پر وہ سچے دل سے چلنا چاہتا ہے اور واقع میں چل بھی رہا ہے۔

تیسرا گروہ اپنے مرتبۂ عقلی کے لحاظ سے سب سے زیادہ فروتر ہے، پہلے دونوں گروہوں کی غلطی تو یہ ہے کہ وہ عقل سے اتنا کام کر لیتے ہیں جتنا وہ نہیں کر سکتی۔ اور اس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ سرے سے عقل سے کام ہی نہیں لیتا، یا لیتا ہے تو اتنا کم کہ نہ لینے کے برابر۔ ایک

صاحبِ عقل انسان کے لیے اس سے زیادہ شرم ناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی اعتقاد رکھتے تھے، یا فلاں قوم جو بڑی ترقی یافتہ ہے وہ بھی اسی عقیدہ کی معتقد ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے دینی یا دنیوی معاملات میں بعض طریقوں کی صرف اس لیے پیروی کرتا ہو کہ باپ دادا سے وہی طریقہ چلا آ رہا ہے، یا بعض طریقوں کو صرف اس بنا پر اختیار کرتا ہو کہ اس کے عہد کی غالب قوموں میں وہی طریقے رائج ہیں، وہ در اصل اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ خود اس کے بھیجے میں دماغ اور دماغ میں سوچنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس کے پاس خود کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہو۔ اتفاقاً وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہو گیا اس لیے ہندو مذہب کو صحیح سمجھتا ہے، اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوتا تو اسلام کو برحق مانتا، اگر عیسائی کی اولاد ہوتا تو عیسائیت پر جان دیتا۔ اسی طرح یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں فرنگی قومیں برسرِ اقتدار ہیں اس لیے وہ فرنگی طور طریقوں کو معیارِ تہذیب سمجھتا ہے۔ اگر چینی برسرِ اقتدار ہوتے تو یقیناً اس کے نزدیک چینی طور طریقے معیارِ تہذیب ہوتے اور اگر آج دنیا پر افریقہ کے حبشیوں کا تسلط ہو جائے تو کوئی شک نہیں کہ یہ خفیف العقل انسان حبشیت کو انسانیت کا عطر سمجھنے لگے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لیے یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے یا دنیا میں آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے، دنیا میں تو پہلے بھی حماقتیں ہوئی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارا کام ان حماقتوں کی اندھا دھند پیروی کرنا نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے قدیم یا جدید زمانے کے ہر طریقے کی پیروی کرنے لگیں، ہر راہرو کے دامن سے دامن باندھ کر چل کھڑے ہوں خواہ وہ کانٹوں کی طرف جا رہا ہو یا خندق کی طرف، ہمیں خدا نے عقل اسی لیے دی ہے کہ دنیا کے اچھے بُرے میں تمیز کریں، کھوٹے اور کھرے کو پرکھ کر دیکھیں، کسی کو رہنما بنانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیں کہ وہ کدھر جانے والا ہے۔

اسلام ان تینوں گروہوں کو غلط کار ٹھہراتا ہے۔

پہلے گروہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ نہ تو یہ لوگ کسی روشنی والے کو ہادی اور رہنما مانتے ہیں نہ ان کے پاس خود ہی حق کا نور ہے کہ اس کے اجالے میں راہ طے کریں۔ اُن کی مثال ایسے شخص

کی سی ہے جو اندھیرے میں محض اندازے اور اٹکل سے چل رہا ہو۔ ممکن ہے کہ کہیں سیدھے راستے چلے اور ممکن ہے کہیں گڑھے میں جا پڑے۔ اس لیے کہ اندازہ کوئی یقینی چیز نہیں ہے۔ اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے بلکہ زیادہ تر امکان غلطی ہی کا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ (یونس: ۶۶)

"جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو خدائی کا حصہ دار ٹھہرا کر ان کو پکارتے ہیں جانتے ہو کہ وہ کس چیز کی پیروی کرتے ہیں؟ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض اندازے پر چلتے ہیں۔"

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝ (النجم: ۲۸)

"وہ محض گمان پر چلتے ہیں اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ہدایت سے ذرہ برابر بھی بے نیاز نہیں کرتا۔"

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ۝ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ۝ (النجم: ۲۳، ۲۴)

"وہ گمان اور اپنے نفس کی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے۔ کیا انسان کے لیے وہی چیز حق ہے جس کی وہ تمنا کرے؟"

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ (الجاثیہ: ۲۳)

"کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا؟ باوجودیکہ وہ علم رکھتا ہے مگر اللہ نے اسے گمراہ کر دیا، اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔"

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا

يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (القصص: ۵۰)

"اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے نفس کی خواہش کی پیروی کی؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا۔"

نزول قرآن کے زمانے میں دوسرے گروہ کے نمائندے بنی اسرائیل تھے۔ اپنے آپ کو موسوی اور متبع تورات کہا کرتے تھے، مگر عقائد اور معاملات میں کم و بیش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طریقے اور تورات کی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس پر لطف یہ تھا کہ اپنے اس انحراف پر نادم نہ تھے، بجائے اس کے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو تورات کے مطابق ڈھالتے وہ تورات میں لفظی و معنوی تحریفیں کر کے اس کو اپنے افکار و اعمال کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے۔ تورات کی اصلی تعلیمات کو چھپا کر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ گویا وہی دراصل تورات کی تعلیمات ہیں۔ خدا کے جو بندے انھیں اس گمراہی پر متنبہ کرتے اور ان کی خواہشات کے خلاف کلام الٰہی کے اتباع کی دعوت دیتے تھے، ان کو وہ گالیاں دیتے، جھوٹا قرار دیتے حتیٰ کہ قتل تک کر دیتے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ (المائدہ: ۱۳)

"وہ الفاظ کو ان کے مواقع سے پھیر دیتے ہیں اور انھوں نے بہت سی ان تعلیموں کو بھلا دیا ہے جو انھیں دی گئی تھیں۔ تمھیں ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی چوری کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ اس خیانت سے ان کے بہت کم آدمی بچے ہوئے ہیں۔"

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (آل عمران: ۷۱)

"اے اہل کتاب! تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور جانتے بوجھتے حق پر پردہ ڈالتے ہو؟"

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝ (المائدہ: ۷۰)

"جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول پیغام لے کر آیا جو ان کے نفس کی خواہشوں کے مطابق نہ تھا تو کسی کو انھوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔"

اور پھر اُن سے صاف کہہ دیتا ہے:

لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (المائدہ:۶۸)

"تم ہرگز راہِ راست پر نہیں ہو، تاوقتیکہ توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو اور اس کتاب کو نہ مانو جو تمہارے رب کے پاس سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے (یعنی قرآن)۔"

تیسرے گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے:

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (البقرہ:۱۷۰)

"اور جب اُن سے کہا گیا کہ اس ہدایت پر چلو جو اللہ نے اتاری ہے تو انھوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا وہ اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے چاہے وہ نہ سمجھتے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں؟"

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (المائدہ:۱۰۴)

"اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس میں ہم نے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا وہ طریقہ اس صورت میں بھی ان کے لیے کافی ہے جب کہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں۔"

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ (الانعام:۱۱۶)

"اور اگر تو نے بہت سے ان لوگوں کی پیروی کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے رستے سے بھٹکا دیں گے وہ تو محض گمان پر چلتے ہیں اور ان کا طریقہ بالکل اٹکل اور اندازہ پر ہے۔"

جو لوگ خود اپنی عقل و فہم سے کام لیتے، خود کھوٹے اور کھرے کو نہیں پرکھتے اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، ان کو قرآن اندھا، گونگا، بہرہ، بے عقل قرار دیتا ہے: صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ (البقرہ:۲۱) اور انھیں جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے، بلکہ اُن سے بھی بدتر، کیوں کہ جانور تو عقل رکھتا ہی نہیں اور وہ عقل رکھتے ہیں۔ مگر اُن سے کام نہیں لیتے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (الاعراف:۱۷۹)۔

ان تینوں گروہوں کو جن کے طریقے افراط و تفریط پر مبنی ہیں، رد کر دینے کے بعد قرآن ایسے لوگوں کا ایک گروہ بنانا چاہتا ہے جو اعتدال اور توسط کی راہ پر ہوں، اُمَّةً وَّسَطًا ہوں، قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ہوں۔

یہ اعتدال اور توسط کی راہ کیا ہے؟ یہ کہ پہلے تم ان سب پردوں کو چاک کر دو جو قدیم روایات اور جدید تعلیمات نے تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈال رکھے ہیں، عقلِ سلیم کی صاف روشنی میں آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز باطل؟ دہریت صحیح ہے یا خدا پرستی؟ توحید صحیح ہے یا شرک؟ انسان راہِ راست پر چلنے کے لیے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے یا نہیں؟ انبیاء علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے یا معاذ اللہ جھوٹے۔ قرآن جس طریقہ کو پیش کرتا ہے وہ سیدھا ہے یا ٹیڑھا؟ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ خدا کو ماننا انسانی فطرت کا عین مقتضیٰ ہے اور خدا حقیقت میں وہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر تمہارا ضمیر تسلیم کرے کہ انسان سیدھی راہ پانے کے لیے خدا کی بخشی ہوئی روشنی کا یقیناً محتاج ہے اور یہ روشنی وہی ہے جو نوعِ بشری کے سچے رہبر انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کو دیکھ کر تم کو یقین آ جائے کہ اس اعلیٰ سیرت کا انسان ہرگز دنیا کو دھوکا نہیں دے سکتا، اور انھوں نے جب رسولِ خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں، اگر قرآن کا مطالعہ کر کے تمہاری عقل یہ فیصلہ کر دے کہ انسان کے لیے اعتقاد اور عمل کا سیدھا راستہ وہی ہے جو اس کتاب نے پیش کیا ہے اور یہ کتاب یقیناً کتابِ الٰہی ہے تو تمام دنیا کی ملامت و مخالفت سے بے خوف ہو کر، ہر نقصان کے ڈر اور فائدے کے لالچ سے دل کو پاک کر کے اس چیز پر

ایمان لے آؤ جس کی صداقت پر تمہارا ضمیر گواہی دے رہا ہے۔

پھر جب تم نے عقلِ سلیم کی مدد سے حق اور باطل میں تمیز کر لی اور باطل کو چھوڑ کر حق پر ایمان لے آئے، تو عقل کے امتحان اور اس کی تنقید کا کام ختم ہو گیا۔ ایمان لانے کے بعد فیصلہ کرنے اور حکم دینے کا اختیار عقل سے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی طرف منتقل ہو گیا۔ اب تمہارا کام فیصلہ کرنا نہیں بلکہ ہر اس حکم کے آگے سر جھکا دینا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے تم کو دیا ہے۔ تم اپنی عقل کو ان احکام کے سمجھنے، ان کی باریکیوں اور حکمتوں تک پہنچنے، اور ان کو اپنی زندگی کے جزئیات پر منطبق کرنے میں استعمال کر سکتے ہو۔ مگر کسی حکمِ خداوندی میں چون و چرا کرنے کا حق تمہیں نہیں ہے، خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے، خواہ اللہ اور اس کے رسول کا کوئی فیصلہ تمہیں اپنی دنیوی اغراض کے لحاظ سے مفید نظر آئے یا غیر مفید، خواہ اللہ کا ارشاد اور رسول کا فرمان دنیا کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے مطابق ہو یا منافی، تمہارا کام بہر حال اس کے آگے سر جھکا دینا ہے کیوں کہ جب تم نے خدا کو مان لیا، رسول تسلیم کر لیا کہ خدا کا رسول جو کچھ پیش کرتا ہے خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے، اپنے دل سے گھڑی ہوئی کوئی بات پیش نہیں کرتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳، ۴) تو اس یقین و اذعان کا عقلی نتیجہ یہ ہے کہ تم خود اپنی عقل کے فیصلوں پر کتاب اللہ اور سنت رسول کے فیصلوں کو ترجیح دو۔ اور جو عقائد یا امر و نہی کے احکام خدا کی طرف سے خدا کے رسول نے بیان کیے ہیں، ان کو اپنی عقل، اپنے علم، اپنے تجربات، یا دوسرے اہلِ دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں مومن ہوں اور پھر چون و چرا بھی کرتا ہے، وہ اپنے قول کی آپ تردید کرتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ایمان اور چون و چرا میں کھلا ہوا تضاد ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ ڈسپلن صرف ماننے اور اطاعت کرنے سے قائم ہوتا ہے۔ چون و چرا کا دوسرا نام انارکی ہے۔

اسی اعتدال اور توسط کے طریقہ کا نام "اسلام" ہے اور جو گروہ اس راستہ پر چلتا ہو اس کا نام "مسلم" ہے۔

اسلام کے معنیٰ انقیاد، اطاعت اور تسلیم کے ہیں۔ اور مسلم وہ ہے جو حکم دینے والے کے امر اور منع کرنے والے کی نہی کو بلا اعتراض تسلیم کرے۔ پس یہ نام خود ہی اس حقیقت کا پتہ

دے رہا ہے کہ ان تینوں گروہوں اور ان کے طریقوں کو چھوڑ کر یہ چوتھا گروہ ایک نئے مسلک کے ساتھ اسی لیے قائم کیا گیا ہے کہ یہ خدا اور رسول کے حکم کو مانے اور اس کے آگے سر جھکا دے۔ اس گروہ کا کام یہ نہیں ہے کہ ہر معاملے میں صرف اپنی عقل کی پیروی کرے۔ نہ یہ ہے کہ احکامِ الٰہی میں سے جو کچھ اس کی اغراض کے مطابق ہو اس کو مانے اور جو کچھ اغراض کے خلاف ہو، اس کو رد کر دے، نہ یہ کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کو چھوڑ کر انسانوں کی اندھی تقلید کرے خواہ وہ انسان مردہ ہوں یا زندہ۔

اب اس بات میں قرآن مجید کی تصریحات بالکل صاف ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور رسول کا حکم آ جائے تو مومنوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶ (الاحزاب: ۳۶)

"کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔"

وہ کہتا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ کو ماننا اور کچھ کو رد کر دینا دنیا اور آخرت میں رسوا کن ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵ (البقرہ: ۸۵)

"کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کی سزا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی رسوائی ہو اور آخرت میں ایسے لوگ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔"

وہ کہتا ہے کہ فیصلہ صرف کتاب الٰہی کے مطابق ہونا چاہیے خواہ وہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو یا نہ ہو:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ (المائدہ:۴۸)

"تو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتاری ہے اور جو حق تیرے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔"

وہ کہتا ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (المائدہ:۴۷)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔"

اور ہر فیصلہ جو کتاب الٰہی کے خلاف ہے۔ جاہلیت کا فیصلہ ہے۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ (المائدہ:۵۰)

"(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالاں کہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔"

وہ کہتا ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا

قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (النسآ:۵۹تا۶۵)

"اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ اور اگر تم حقیقت میں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو تو جس کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع پیدا ہو، اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہی بہتر طریقہ ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی اچھا ہے۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تیری جانب بھیجی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے بھیجی گئی تھیں۔ مگر چاہتے ہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے معاملہ میں حکم بنائیں حالاں کہ انھیں اس کے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انھیں بھٹکا کر راہ راست سے دور ہٹا لے جائے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف، تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ وہ تجھ سے کنی کاٹ جاتے ہیں۔ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔ نہیں! تیرے پروردگار کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلافات میں تجھ کو حکم نہ بنائیں۔ اور یہ بھی کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ جو فیصلہ تو کرے اس پر وہ اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں۔ اور بے چون وچرا اس کے آگے سر جھکا دیں۔"

ان تصریحات سے "اسلام" اور "مسلم" کی وجہ تسمیہ معلوم ہوگئی، اب ہم سب لوگوں کو جنھوں نے مردم شماری میں اپنے آپ کو مسلمان لکھوایا ہے غور کرنا چاہیے کہ ہم پر لفظ مسلم کا اطلاق کس حد تک ہوتا ہے اور جس طریقہ پر ہم چل رہے ہیں اس کو اسلام سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے۔

(ترجمان القرآن، رجب ۵۲ھ، نومبر ۱۹۳۳ء)

مسلمان کی طاقت کا اصل منبع

دوسری صدی ہجری کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ بحستان ورنج (موجودہ افغانستان) کے فرماں روا نے جس کا خاندانی لقب رتبیل تھا بنی امیہ کے عمال کو خراج دینا بند کردیا، پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب اس کے پاس طلبِ خراج کے لیے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا۔

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے رہتے تھے اور کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے۔"

کہا گیا کہ وہ لوگ تو گزر گئے۔ رتبیل نے کہا:

"اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شان دار ہیں، مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے۔ تم سے زیادہ طاقت ور تھے۔"

مؤرخ لکھتا ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کردیا اور تقریباً نصف صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین وتبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمہ مجتہدین کا زمانہ تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی۔ مسلمان ایک زندہ اور طاقتور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھارہے تھے۔ ایران، روم، مصر، افریقہ، اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہوچکے تھے۔ اور ساز وسامان، شان وشوکت اور دولت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکام شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی۔ سمع وطاعت کا نظام قائم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا

تھا مگر پھر بھی جو لوگ عہدِ صحابہ کے فاقہ کش خستہ حال صحرانشینوں سے زور آزمائی کرچکے تھے انھوں نے ان سروسامان والوں اور ان بے سروسامانوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق محسوس کیا۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفۂ تاریخ والے اس کو محض بدویت وحضریت کے فرق پر محمول کریں گے، وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنادیا تھا مگر میں یہ کہوں گا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوصِ نیت، اخلاق، اور اطاعت خدا اور رسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصلی قوت یہی چیزیں تھیں، ان کی قوت نہ کثیر تعداد پر مبنی تھی، نہ اسباب وآلات کی افراط پر، نہ مال ودولت کی فراوانی پر، نہ علوم وصناعات کی مہارت پر، نہ تمدن وحضارت کے لوازم پر۔ یہ صرف ایمان وعملِ صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا۔ اس نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھادی تھی۔ جب قوت وعزت کا سرمایہ ان کے پاس تھا تو یہ قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود طاقت ور اور معزز تھے اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہوگیا تو یہ کثرتِ تعداد اور سروسامان کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

رتبیل نے ایک دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کہا وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار وعظوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل یہ حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصلی طاقت اس کی آراستہ فوجیں، اس کے آلاتِ جنگ، اس کے خوش خور وخوش پوش سپاہی، اور اس کے وسیع ذرائع ووسائل نہیں ہیں بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات اور اس کے بلند تخیلات ہیں۔ یہ طاقت وہ روحانی طاقت ہے جو مادی وسائل کے بغیر دنیا میں اپنا سکہ چلادیتی ہے۔ خاک نشینوں کو تخت نشینوں پر غالب کردیتی ہے۔ صرف زمینوں کا وارث ہی نہیں بلکہ دلوں کا مالک بھی بنادیتی ہے۔ اس طاقت کے ساتھ کھجور کی چپلیں پہننے والے، سوکھی ہڈیوں والے، بے رونق چہروں والے، چھتڑوں والے، چھتڑوں میں لپٹی ہوئی تلواریں رکھنے والے لوگ دنیا پر وہ رعب، وہ سطوت وجبروت وقدر ومنزلت، وہ اعتبار واقتدار جمادیتے ہیں جو اس طاقت کے بغیر شان دار لباس پہننے والے، بڑے ڈیل ڈول والے، بارونق چہروں والے، اونچی بارگاہوں والے، بڑی بڑی منجنیقیں اور ہولناک دبابے رکھنے والے نہیں جماسکتے۔ اخلاقی طاقت کی فراوانی، مادی وسائل کے فقدان کی تلافی کردیتی ہے۔ مگر مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی

طاقت کے فقدان کی تلافی کبھی نہیں کرسکتی۔ اس طاقت کے بغیر محض مادّی وسائل کے ساتھ اگر غلبہ نصیب ہو بھی گیا تو ناقص اور عارضی ہوگا۔ کامل اور پائیدار نہ ہوگا۔ دل کبھی مسخر نہ ہوں گے۔ صرف گردنیں جھک جائیں گی اور وہ بھی اکڑنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد رہیں گی۔

کسی عمارت کا استحکام اس کے رنگ وروغن، نقش ونگار، زینت وآرائش، صحن وچمن اور ظاہری خوش حالی سے نہیں ہوتا۔ نہ مکینوں کی کثرت، نہ ساز وسامان کی افراط اور اسباب وآلات کی فراوانی اس کو مضبوط بناتی ہے۔ اگر اس کی بنیادیں کمزور ہوں، دیواریں کھوکھلی ہوں۔ ستونوں کو گھن لگ جائے، کڑیاں اور تختے بوسیدہ ہوجائیں تو اس کو گرنے سے کوئی چیز نہیں بچاسکتی، خواہ وہ مکینوں سے خوب معمور ہو۔ اور اس میں کروڑوں روپے کا مال واسباب بھرا پڑا ہو، اور اس کی سجاوٹ نظروں کو لبھاتی اور دلوں کو موہ لیتی ہو۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو، تمہاری نظریں مظاہر پر اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ مگر حوادثِ زمانہ کا معاملہ نمائشی مظاہر سے نہیں بلکہ اندرونی حقائق سے پیش آتا ہے۔ وہ عمارت کی بنیادوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دیواروں کی پختگی کا امتحان لیتے ہیں۔ ستونوں کی استواری کو جانچتے ہیں اگر یہ چیزیں مضبوط اور مستحکم ہوں تو زمانے کے حوادث ایسی عمارت سے ٹکرا کر پلٹ جائیں گے اور وہ ان پر غالب آجائے گی خواہ وہ زینت وآرائش سے یکسر محروم ہو ورنہ حوادث کی ٹکریں آخر کار اس کو پاش پاش کرکے رہیں گی اور وہ اپنے ساتھ اپنے مکینوں اور اسبابِ زینت کو بھی لے بیٹھے گی۔

ٹھیک یہی حال حیاتِ قومی کا بھی ہے۔ ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقت ور اور سربلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، اس کے لباس، اس کی سواریاں، اس کے اسبابِ عیش، اس کے فنونِ لطیفہ، اس کے کارخانے، اس کے کالج نہیں ہیں، بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے، اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہونا اور اعمال پر حکمراں بن جانا ہے۔ یہ تین چیزیں یعنی اصول کی صحت، ان پر پختہ ایمان اور عملی زندگی پر ان کی کامل فرماں روائی، حیاتِ قومی میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک عمارت میں اس کی مستحکم بنیادوں، اس کی پختہ دیواروں اور اس کے مضبوط ستونوں کی ہے۔ جس قوم میں یہ تینوں چیزیں بہ درجۂ اتم موجود ہوں وہ دنیا پر غالب ہوکر رہے گی۔ اس کا کلمہ بلند ہوگا، خدا کی زمین میں اس کا سکہ چلے گا، دلوں میں اس کی دھاک

بیٹھے گی، گردنیں اس کے حکم کے آگے جھک جائیں گی اور اس کی عزت ہوگی، خواہ وہ جھونپڑیوں میں رہتی ہو۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہو، فاقوں سے اس کے پیٹ پٹخے ہوئے ہوں۔ اس کے ہاں ایک بھی کالج نہ ہو، اس کی بستیوں میں ایک بھی دھواں اڑانے والی چمنی نظر نہ آئے اور علوم و صناعات میں وہ بالکل صفر ہو۔ تم جن چیزوں کو سامانِ ترقی سمجھ رہے ہو وہ محض عمارت کے نقش و نگار ہیں، اس کے قوائم وارکان نہیں ہیں۔ کھوکھلی دیواروں پر اگر سونے کے پترے بھی چڑھا دو گے تو وہ ان کو گرنے سے نہ بچاسکیں گے۔

یہی بات ہے جس کو قرآن مجید بار بار بیان کرتا ہے۔

وہ اسلام کے اصولوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اس اٹل اور غیر متغیر فطرت کے مطابق ہیں، جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے جو دین ان اصولوں پر قائم کیا گیا ہے وہ دینِ قیم ہے۔ یعنی ایسا دین جو معاش ومعاد کے جملہ معاملات ٹھیک ٹھیک طریقوں پر قائم کردینے والا ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم:۳۰)

پھر وہ کہتا ہے کہ اس دینِ قیم پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے مطابق عمل کرو۔ اس کا نتیجہ خود بہ خود یہ ظاہر ہوگا کہ دنیا میں تم ہی سربلند ہوگے، تم ہی کو زمین کا وارث بنایا جائے گا، تم ہی خلعتِ خلافت سے سرفراز ہوگے اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء:۱۰۵) وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۱۳۹) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور:۵۵) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المائدہ: ۵۶)

بہ خلاف اس کے جو لوگ بہ ظاہر دین کے دائرے میں داخل ہیں، مگر دین نہ تو ان کے دلوں میں بیٹھا ہے اور نہ ان کی زندگی کا قانون بنا ہے، ان کے ظاہر تو بہت شان دار ہیں: وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ (المنافقون:۴) اور ان کی باتیں بہت مزیدار ہیں: وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ (المنافقون:۴) مگر حقیقت میں وہ لکڑی کے کندے ہیں جن میں جان نہیں: كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (المنافقون:۴) وہ خدا سے بڑھ کر انسانوں سے ڈرتے ہیں: يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً (النساء:۷۷) ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں کہ دیکھنے میں پانی نظر آئیں مگر

حقیقت میں کچھ نہیں: اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۭ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـئًا (النور: ۳۹) ایسے لوگوں کو اجتماعی قوت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی، کیوں کہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ خلوصِ نیت کے ساتھ کسی کام میں اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے: بَاۡسُهُمۡ بَيۡنَهُمۡ شَدِيۡدٌ ؕ تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى ؕ (الحشر: ۱۴) ان کو وہ قوت ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی جو صرف مؤمنینِ صالحین کا حصہ ہے: لَا يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ جَمِيۡعًا اِلَّا فِىۡ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ (الحشر: ۱۴) ان کو دنیا کی امت کا منصب کبھی نہ ملے گا: قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ۝ (البقرۃ: ۱۲۴) ان کے لیے بہ جز اس کے اور کوئی کام نہیں کہ دنیا میں بھی ذلت و خواری اور آخرت میں بھی عذاب و عقاب: لَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ وَّلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝ (البقرۃ: ۱۱۴)

آپ تعجب کریں گے کہ قرآن نے مسلمانوں کی ترقی اور ان کے ایک حکمراں جماعت بننے اور سب پر غالب آ جانے کا ذریعہ صرف ایمان و عملِ صالح کو قرار دیا اور کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونی ورسٹیاں بناؤ، کالج کھولو، کارخانے قائم کرو، جہاز بناؤ، کمپنیاں قائم کرو، بینک کھولو، سائنس کے آلات ایجاد کرو، لباس اور معاشرت کے انداز و اطوار میں ترقی یافتہ قوموں کی نقل کرو۔ نیز اس نے تنزل و انحطاط اور دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی کا واحد سبب بھی نفاق کو ٹھہرایا نہ کہ ان اسباب کے فقدان کو جنھیں آج کل دنیا اسبابِ ترقی سمجھتی ہے۔

لیکن اگر آپ قرآن کی اسپرٹ کو سمجھ لیں تو آپ کا یہ تعجب خود رفع ہو جائے گا۔ سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے یہ ہے کہ ''مسلمان'' جس شے کا نام ہے اس کا قوام بجز اسلام کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کی حقیقت صرف اسلام سے متحقق ہوتی ہے۔ اگر وہ اس پیغام پر ایمان رکھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور ان قوانین کا اتباع کرے جن کو آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے سے نازل کیا گیا ہے تو اس کا اسلام متحقق ہو جائے گا خواہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے ساتھ شامل نہ ہو جو اسلام کے ماسوا ہیں۔ بہ خلاف اس کے اگر وہ ان تمام زیورات سے آراستہ ہو جو زینتِ حیاتِ دنیا کے قبیل سے ہیں مگر ایمان اس کے دل میں نہ ہو اور قوانینِ اسلامی کے اتباع سے اس کی زندگی خالی ہو تو وہ گریجویٹ ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے، کارخانہ دار ہو سکتا ہے، بینکر ہو سکتا ہے، جنرل یا امیر البحر ہو سکتا ہے، مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ پس کوئی ترقی کسی مسلمان شخص یا قوم کی ترقی نہ ہوگی جب تک کہ سب

چیزوں سے پہلے اس شخص یا قوم میں حقیقتِ اسلامی متحقق نہ ہو جائے اس کے بغیر وہ ترقی خواہ کیسی ہی ترقی ہو مسلمان کی ترقی نہ ہوگی اور ایسی ترقی ظاہر ہے کہ اسلام کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک بات تو یہ ہے کہ کوئی قوم سرے سے مسلمان نہ ہو، اور اس کے افکار و اخلاق اور نظامِ اجتماعی کی اساس اسلام کے سوا کسی اور چیز پر ہو۔ ایسی قوم کے لیے بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ان اخلاق، سیاسی، معاشی اور عمرانی اصولوں پر کھڑی ہو سکے جو اسلام سے مختلف ہیں اور اس ترقی کے منتہیٰ کو پہنچ جائے جس کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے ترقی سمجھتی ہو۔ لیکن یہ بالکل ایک امرِ دیگر ہے کہ کسی قوم کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کی بنیاد اسلام پر ہو، اور اسلام ہی میں وہ عقیدے اور عمل دونوں کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایسی قوم مادی ترقی کے وسائل خواہ کتنی ہی کثرت اور فراوانی کے ساتھ مہیا کر لے، اس کا ایک مضبوط اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے اٹھنا اور دنیا میں سر بلند ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ کیوں کہ اس کی قومیت اور اس کے اخلاق اور تہذیب کی اساس جس چیز پر ہے وہی کمزور ہے! اور اساس کی کمزوری ایسی ہے جس کی تلافی محض اوپری زینت کے سامان کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علوم و فنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لیے یہ تمام چیزیں ثانوی درجہ پر ہیں۔ اساس کا استحکام ان سب پر مقدم ہے، وہ جب مستحکم ہو جائے تو مادی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں اور کیے جانے چاہییں جو اس بنیاد کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ لیکن اگر وہی مضمحل ہو، دل میں اسی کی جڑیں کمزور ہوں اور زندگی پر اسی کی گرفت ڈھیلی ہو تو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوم کے اخلاق کا فاسد ہونا، سیرت کا بگڑ جانا، معاملات کا خراب ہو جانا، نظامِ اجتماعی کی بندشوں کا سست ہو جانا اور قوتوں کا پراگندہ ہو جانا ناگزیر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ قوم کی طاقت کمزور ہو جائے اور بین الملی قوتوں کے ترازو میں اس کا پلڑا روز بروز ہلکا ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ دوسری قومیں اس پر غالب آ جائیں۔ ایسی حالت میں مادی اسباب کی فراوانی اور سند یافتہ فضلاء کی افراط اور خارجی زیب و زینت کی چمک دمک کسی کام نہیں آ سکتی۔

ان سب سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ہے۔ قرآن حکیم نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ ''تم ہی سر بلند ہو گے اگر تم مؤمن ہو۔'' ''اور اللہ کی پارٹی والے ہی غالب ہوں گے۔'' اور

جو لوگ ایمان وعمل صالح سے آراستہ ہوں گے ان کو زمین کی خلافت ضرور ملے گی۔ اس وثوق کی بنیاد کیا ہے؟ کس بنا پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ دوسری قومیں خواہ کیسے ہی مادی وسائل کی مالک ہوں ان پر مسلمان صرف ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے غالب آجائیں گے؟

اس عقیدہ کو قرآن خود حل کر دیتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝۷۳ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۷۴ (الحج: ۷۳، ۷۴)

”لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ اس کو غور سے سنو۔ خدا کو چھوڑ کر تم جن چیزوں کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی تک کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اس کام کے لیے مل کر زور لگائیں اور اگر ایک مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے وہ چیز چھڑا لینے کی قدرت بھی ان میں نہیں۔ مطلوب بھی ضعیف اور اس کا طالب بھی ضعیف۔ حالاں کہ درحقیقت اللہ ہی قدرت اور عزت والا ہے۔“

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ (العنکبوت: ۴۱)

”جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو کارساز ٹھہرایا، ان کی مثال ایسی ہے جیسے مکڑی، کہ وہ گھر بناتی ہے حالاں کہ سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مادی طاقتوں پر اعتقاد کرتے ہیں ان کا اعتماد دراصل ایسی چیزوں پر ہے جو بذاتِ خود کسی قسم کی بھی قوت نہیں رکھتیں، ایسے بے زوروں پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی ویسے ہی بے زور ہو جاتے ہیں جیسے ان کے سہارے بے زور ہیں۔ وہ اپنے نزدیک جو مستحکم قلعے بناتے ہیں وہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہیں۔ ان میں کبھی یہ طاقت ہو ہی نہیں سکتی کہ ان لوگوں کے مقابلے میں سر اٹھا سکیں جو حقیقی قدر و عزت رکھنے والے خدا پر اعتماد کر کے اٹھیں۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (البقرۃ: ۲۵۶)

”جو طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس نے مضبوط رسّی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔“

قرآن دعوے کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ جب کبھی اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کا مقابلہ ہوگا تو غلبہ اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوگا:

وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۝۲۲ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝۲۳ (الفتح: ۲۲، ۲۳)

”اگر وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے تم سے جنگ کریں گے تو ضرور پیٹھ پھیر جائیں گے اور کوئی یار و مددگار نہ پائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم کبھی اللہ کی سنت میں تغیر نہ پاؤ گے۔“

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ (آل عمران: ۱۵۱)

”ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے کیوں کہ انھوں نے خدائی میں ان چیزوں کو شریک کر دیا ہے جن کو خدا نے کوئی تمکن نہیں بخشا ہے۔“

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی طرف سے لڑتا ہے اس کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے اور جس کے ساتھ خدائی طاقت ہو اس کے مقابلے میں کسی کا زور چل ہی نہیں سکتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱ (محمد: ۱۱)

”یہ اس لیے کہ ایمان داروں کا مددگار تو اللہ ہے اور کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔“

وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال: ۱۷)

”جب تو نے تیر پھینکا تو وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا۔“

یہ تو مومنِ صالح کی سطوت کا حال ہے۔ دوسری طرف یہ بھی خدا کا قانون ہے کہ جو شخص ایمان دار ہوتا ہے، جس کی سیرت پاکیزہ ہوتی ہے، جس کے اعمال نفسانیت کی آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں، جو ہوائے نفس اور اغراضِ نفسانی کے بجائے خدا کے مقرر کیے ہوئے قانون کی ٹھیک پیروی کرتا ہے، اس کی محبت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے، دل آپ ہی آپ اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، نگاہیں اس کی طرف احترام سے اٹھتی ہیں، معاملات میں اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، دوست تو دوست دشمن اس کو صادق سمجھتے ہیں۔ اور اس کے عدل، اس کی عفت اور اس کی وفاشعاری پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم:۹۶)

"جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اللہ ان کی محبت دلوں میں ڈال دے گا۔"

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ (ابراہیم:۲۷)

"ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت کے ساتھ جما دیتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔"

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾ (النحل:۹۷)

"جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو تو ہم ضرور اس کو بہترین زندگی بسر کرائیں گے اور ان بہترین اعمال کا اجر دیں گے جو وہ کرتے رہے۔"

مگر یہ سب کس چیز کے نتائج ہیں؟ محض زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے کے نہیں۔ مسلمانوں کے سے نام رکھ لینے اور معاشرت کے چند مخصوص اطوار اختیار کرنے اور چند گنی چنی رسمیات ادا کر لینے کے نہیں، قرآن حکیم ان نتائج کے ظہور کے لیے ایمان اور عملِ صالح کی شرط لگاتا ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی حقیقت تمہارے قلب و روح میں اس قدر جاگزیں ہو جائے کہ تمہارے تخیلات اور افکار اور اخلاق و معاملات سب پر اسی کا غلبہ ہو، تمہاری

زندگی اسی کلمۂ طیبہ کے معنوی قالب میں ڈھل جائے، تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال راہ نہ پا سکے جو اس کلمہ کے معنی سے مختلف ہو اور تم سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اس کلمہ کے مقتضی کے خلاف ہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو زبان سے ادا کرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تمہاری زندگی میں اس کے ساتھ ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ تمہاری رگ رگ میں تقویٰ کی روح سرایت کر جائے۔ اللہ کے سوا تمہارا ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلے۔ اللہ کے سوا کسی کا خوف تمہارے دل میں نہ رہے۔ تمہاری محبت اور تمہارا بغض اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو۔ اللہ کے قانون کے سوا تمہاری زندگی پر کسی اور کا قانون نافذ نہ ہو۔ تم اپنے نفس اور اس کی ساری خواہشوں اور اس کے تمام مرغوبات اور محبوبات کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مقابلہ میں تمہارے پاس سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کے سوا کوئی اور قول و فعل نہ ہو۔ جب ایسا ہو گا تو تمہاری قوت صرف تمہارے اپنے نفس اور جسم کی قوت نہ ہوگی بلکہ اس احکم الحاکمین کی قوت ہوگی، جس کے آگے زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سربہ سجود ہے اور تمہاری ذات اس نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے جلووں سے معمور ہو جائے گی جو تمام عالم کا حقیقی محبوب و معشوق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی چیز مسلمانوں کو حاصل تھی پھر اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس زمانہ میں جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کی کایا پلٹ گئی۔ مِس خام سے یکایک وہ کندن بن گیا۔ اس کی ذات میں وہ کشش پیدا ہوئی کہ دل اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اس پر جس کی نظر پڑتی وہ محسوس کرتا کہ گویا تقویٰ اور پاکیزگی اور صداقت کو مجسم دیکھ رہا ہے۔ وہ اَن پڑھ، مفلس، فاقہ کش، پشمینہ پوش اور بوریا نشین ہوتا، مگر پھر بھی اس کی ہیبت دلوں میں ایسی بیٹھتی کہ بڑے بڑے شان و شوکت والے فرماں رواؤں کو نصیب نہ تھی۔ ایک مسلمان کا وجود گویا ایک چراغ تھا کہ جدھر وہ جاتا اس کی روشنی اطراف و اکناف میں پھیل جاتی اور اس چراغ سے سینکڑوں ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے پھر جو اس روشنی کو قبول نہ کرتا اور اس سے ٹکرانے کی جرأت کرتا تو اس کو جلانے اور فنا کر دینے کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔

ایسی ہی قوتِ ایمانی اور طاقت و سیرت رکھنے والے مسلمان تھے کہ جب وہ ساڑھے تین سو سے زیادہ نہ تھے تو انھوں نے تمام عرب کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا اور جب وہ چند لاکھ کی

تعداد کو پیچھے تو ساری دنیا کو مسخر کر لینے کے عزم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جو قوت ان کے مقابلے پر آئی پاش پاش ہو گئی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے مسلمان کی اصلی طاقت یہی ایمان اور سیرتِ صالحہ کی طاقت ہے، جو صرف ایک لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت دل میں بیٹھ جانے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اگر یہ حقیقت دل میں جاں گزیں نہ ہو، محض زبان پر یہ الفاظ جاری ہوں، مگر ذہنیت اور عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو، لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی انسان وہی کا وہی رہے جو اس سے پہلے تھا۔ اور اس میں اور لا الٰہ الا اللہ کا انکار کرنے والوں میں اخلاقی و عملی حیثیت سے کوئی فرق نہ ہو۔ وہ بھی انہی کی طرح غیر اللہ کے آگے گردن جھکائے اور ہاتھ پھیلائے، ان ہی کی طرح غیر خدا سے ڈرے اور غیر خدا کی رضا چاہے اور غیرِ خدا کی محبت میں گرفتار ہو، ان ہی کی طرح ہوائے نفس کا بندہ ہو اور قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرے، اس کے خیالات اور ارادوں اور نیتوں میں بھی وہی گندگی ہو جو ایک غیر مؤمن کے خیالات، ارادات اور نیات میں ہو سکتی ہے اور اس کے اقوال و افعال و معاملات بھی ویسے ہی ہوں جیسے ایک غیر مؤمن کے ہوتے ہیں تو پھر مسلمان کو نامسلمان پر فوقیت کس بنا پر ہو؟ روحِ ایمان اور روحِ تقویٰ نہ ہونے کی صورت میں ایک مسلمان ویسا ہی ایک بشر تو ہے جیسا ایک نامسلمان ہے۔ اس کے بعد مسلم اور غیر مسلم کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت اور مادی وسائل کے اعتبار سے ہوگا اور اس مقابلہ میں جو طاقت ور ہوگا وہ کمزور پر غالب آ جائے گا۔

ان دونوں حالتوں کا فرق تاریخ کے اوراق میں اتنا نمایاں ہے کہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے، یا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیے تھے اور اٹک کے کنارے سے لے کر اٹلانٹک کے سواحل تک اسلام پھیلا دیا تھا۔ یا اب کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور غیر مسلم طاقتوں سے دبے ہوئے ہیں جن آبادیوں میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں اور ان کو بسے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہاں اب بھی کفر و شرک موجود ہے۔

(ترجمان القرآن، شوال ۵۳ھ، جنوری ۱۹۳۵ء)

کیشِ مرداں نہ کہ مذہبِ گوسفنداں

مسئلہ سود پر میرے مضامین کو دیکھ کر ایک خیال کا بار بار اظہار کیا گیا ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ "موجودہ زمانہ میں سرمایہ داری نظام، سیاسی طاقت کے ساتھ ہمارے گرد و پیش کی پوری معاشی دنیا پر مسلط ہو چکا ہے، معیشت کی گاڑی اصولِ سرمایہ داری کے پہیوں پر چل رہی ہے۔ سرمایہ دار ہی اس کو چلا رہے ہیں اور وہی قومیں اس کے ذریعہ سے منزلِ ترقی کی طرف بڑھ رہی ہیں جن کے لیے پیدائشِ دولت اور صرفِ دولت کے باب میں کوئی مذہبی یا اخلاقی قید نہیں ہے۔ دوسری طرف ہماری اجتماعی قوت منتشر ہے۔ دنیا کے نظمِ معیشت کو بدلنا تو درکنار ہم خود اپنی قوم میں بھی اسلامی نظمِ معیشت کو ازسرِ نو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب اگر ہماری مذہبی قیود ہم کو زمانے کے چلتے ہوئے نظامِ معاشی میں پورا پورا حصہ لینے سے روک دیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہماری قوم معاشی ترقی و خوش حالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائے گی۔ ہم مفلس ہوتے جائیں گے اور ہمسایہ قومیں دولت مند ہوتی چلی جائیں گی۔ پھر یہ ہماری معاشی کمزوری ہم کو سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بھی ذلیل اور پست کر دے گی۔ یہ محض وہم اور اندیشہ نہیں ہے بلکہ واقعات کی دنیا میں یہی نتیجہ ہم کو نظر آ رہا ہے اور مستقبل میں ہمارا جو کچھ انجام ہونے والا ہے اس کے آثار کچھ ایسے دھندلے نہیں ہیں کہ ان کو نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ پس ہم کو محض شریعت کا قانون بنانے سے کیا فائدہ؟ اسلام کے معاشی اصول بیان کرنے سے کیا حاصل؟ ہم کو یہ بتاؤ کہ ان حالات میں اسلامی قانون کی پابندی کے ساتھ ہمارے لیے اپنی معاشی حالت کو سنبھالنے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اگر نہیں ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت یقیناً پیش آئے گی۔ یا تو مسلمان بالکل تباہ

ہو جائیں گے یا پھر وہ بھی دوسری قوموں کی طرح مجبور ہوں گے کہ ایسے تمام قوانین کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

یہ سوال صرف مسئلہ سود ہی تک محدود نہیں ہے۔ دراصل اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر زندگی کے تمام شعبوں میں سے محض معیشت ہی کا شعبہ ایسا ہوتا جس پر ایک غیر اسلامی نظام مسلط ہو گیا ہوتا تو شاید معاملہ نسبتاً بہت ہلکا ہوتا۔ مگر واقعات کی شہادت کچھ اور ہے۔ اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈالیے، خود اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا پایا جاتا ہے جس پر غیر اسلام کا تسلط نہیں ہے؟ کیا اعتقادات اور افکار و تخیلات پر الحاد و دہریت یا کم از کم شک و ریب کا غلبہ نہیں؟ کیا تعلیم پر ناخدا شناسی کی حکومت نہیں؟ کیا تمدن و تہذیب پر فرنگیت کا استیلاء نہیں؟ کیا معاشرت کی جڑوں تک میں مغربیت اتر نہیں گئی ہے؟ کیا اخلاق اس کے غلبہ سے محفوظ ہیں؟ کیا معاملات اس کے تسلط سے آزاد ہیں؟ کیا قانون اور سیاست اور حکومت کے اصول و فروع، نظریات اور عملیات میں سے کوئی چیز بھی اس کے اثر سے پاک ہے؟

جب حال یہ ہے تو آپ اپنے سوال کو معیشت اور اس کے بھی صرف ایک پہلو تک کیوں محدود رکھتے ہیں؟ اس کو وسیع کیجیے۔ پوری زندگی پر پھیلا دیجیے۔ یوں کہیے کہ زندگی کے دریا نے اپنا رُخ بدل دیا ہے۔ پہلے وہ اس راستے پر بہہ رہا تھا جو اسلام کا راستہ تھا۔ اب وہ اس راستے پر بہہ رہا ہے جو غیر اسلام کا راستہ ہے۔ ہم اس کے رُخ کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتے۔ ہم میں اتنی قوت بھی نہیں کہ اس کی رَو کے خلاف تیر سکیں۔ ہم کو ٹھیرنے میں بھی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اب ہمیں کوئی ایسی صورت بتاؤ کہ ہم مسلمان بھی رہیں اور اس دریا کے بہاؤ پر اپنی کشتی کو چھوڑ بھی دیں۔ عازمِ کعبہ بھی رہیں اور اس قافلہ کا ساتھ بھی نہ چھوڑیں جو ترکستان کی طرف جا رہا ہے، ہم اپنے خیالات، نظریات، مقاصد، اصولِ حیات اور مناہجِ عمل میں نامسلمان بھی ہوں اور پھر مسلمان بھی ہوں۔ اگر ان اضداد کو جمع کرنے کی کوئی صورت تم نے نہ نکالی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہم اسی دریا کے ساحل پر مر رہیں گے یا پھر اسلام کا لیبل جو ہماری کشتی پر لگا ہوا ہے ایک دن کھرچ ڈالا جائے گا اور یہ کشتی بھی دوسری کشتیوں کے ساتھ دریا کے دھارے پر بہتی نظر آئے گی۔

ہمارے روشن خیال اور "تجدد پسند" حضرات جب کسی مسئلے پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہے، یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی

ہے، ہوا کا رخ اسی طرف ہے، دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں! اخلاق کا سوال ہو، وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیارِ اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ مسلمان اس پرانے معیارِ اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پردے پر بحث ہو، ارشاد ہوگا کہ دنیا سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ جو چیز دنیا سے اٹھ چکی ہے اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں! تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہوگی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ ہی نہیں۔ مدعا یہ کھلا کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ نہیں ہے اور وہ مال کیوں نہ بنیں جس کی مانگ ہے! سود پر تقریر ہو ٹیپ کا بند یہ ہوگا کہ اب دنیا کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا، گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے احتراز کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہو گئی ہے۔ غرض یہ کہ تمدن معاشرت، اخلاق، تعلیم، معیشت، قانون، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس شعبے میں بھی وہ اصولِ اسلام سے ہٹ کر فرنگیت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے زمانے کا رنگ اور ہوا کا رُخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس تنقیدِ مغربی یا درحقیقت اس جزوی ارتداد کے جواز پر برہانِ قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عمارتِ اسلامی کے اجزاء میں سے ہر اس جز کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حملہ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ شکست و ریخت کی یہ تجویزیں جن کو متفرق طور پر پیش کرتے ہو ان کو مل کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ مکان کی ایک ایک دیوار، ایک ایک کمرے اور ایک ایک دالان کو گرانے کی علاحدہ علاحدہ تجویزیں پیش کرنے اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے کیوں نہیں کہتے کہ یہ پورا مکان گرا دینے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس کا رنگ زمانے کے رنگ سے مختلف ہے، اُس کا رُخ ہوا کے رُخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع ان مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جو اب دنیا میں بن رہے ہیں۔

جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان سے تو بحث کرنا ہی فضول ہے، ان کے لیے تو صاف اور سیدھا جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی زحمت آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو دوسرا خوش وضع، خوش نما، خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لے جائیے۔ اگر دریا کے دھارے پر بہنے کا شوق ہے تو اس کشتی کا لیبل کھرچنے کی

تکلیف بھی کیوں اٹھایئے؟ جو کشتیاں پہلے سے بہہ رہی ہیں انھی میں سے کسی میں نقلِ مقام فرمالیجیے۔ جو لوگ اپنے خیالات، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتے، ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں، ہوا پرست ہیں۔ اگر دنیا میں بت پرستی کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے۔ اگر دنیا میں برہنگی کا رواج عام ہو جائے تو وہ یقیناً اپنے کپڑے اتار پھینکیں گے۔ اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل اور دماغ غلام ہیں اور غلامی ہی کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ آج فرنگیت کا غلبہ ہے، اس لیے اپنے باطن سے لے کر ظاہر کے ایک ایک گوشے تک وہ فرنگی بننا چاہتے ہیں۔ کل اگر حبشیوں کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ حبشی بنیں گے۔ اپنے چہروں پر سیاہیاں پھیریں گے، اپنے ہونٹ موٹے کریں گے، اپنے بالوں میں حبشیوں کے سے گھونگر پیدا کریں گے، ہر اس شے کی پوجا کرنے لگیں گے جو حبش سے ان کو پہنچے گی۔ ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بہ خدا اگر کروڑوں کی مردم شماری میں سے ان سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں، اور دنیا میں صرف چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں جن کی تعریف یہ ہو کہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ (المائدہ:۵۴) ’’وہ اللہ کے محبوب ہوں اور اللہ ان کا محبوب ہو۔ مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں پر سخت ہوں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا انھیں خوف نہ ہو۔‘‘ تو اسلام اب سے بدرجہا طاقت ور ہو گا اور ان کروڑوں کا نکل جانا اس کے حق میں ایسا ہو گا جیسے کسی مریض کے جسم سے پیپ اور کچ لہو نکل جائے۔

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ (المائدہ:۵۲)

’’ہم کو خوف ہے کہ ہم پر مصیبت آ جائے گی۔‘‘

یہ آج کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ بہت پرانی آواز ہے جو منافقوں کی زبان سے بلند ہوتی رہی ہے۔ یہی آواز نفاق کی اس بیماری کا پتہ دیتی ہے جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے، اسی آواز کو بلند کرنے والے ہمیشہ مخالفینِ اسلام کے کیمپ کی طرف لپکتے رہے ہیں۔ ہمیشہ سے انھوں

نے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق ہی سمجھا ہے۔ ہمیشہ سے ان کو احکامِ خدا اور رسول کا اتباع گراں ہی گزرتا رہا ہے۔ اطاعت میں جان و مال کا زیاں اور نافرمانی میں حیاتِ دنیا کی ساری کامرانیاں ہمیشہ سے ان کو نظر آتی رہی ہیں۔ پس ان کی خاطر خدا کی شریعت کو نہ ابتداء میں بدلا گیا تھا، نہ اب بدلا جا سکتا ہے اور نہ کبھی بدلا جائے گا۔ یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے۔ ہوا کے رُخ پر اڑنے والے خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رُخ بدلنے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست ہے۔ صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دریا نے رخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رُخ پر بہنے کے لیے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا۔ اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا۔ کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروا نہ ہو گی، وہ ہر اس نقصان کو گوارا کر لے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ و بند ڈھیلے ہو جائیں، اور پانی کی موجیں اس کو نیم جاں کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔

قرآن تمھارے سامنے ہے، انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں تمھارے سامنے ہیں۔ ابتدا سے لے کر آج تک کے علم بردارانِ اسلام کی زندگیاں تمھارے سامنے ہیں۔ کیا ان سب سے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر اڑائے ادھر اڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہائے اُدھر بہہ جاؤ؟ زمانہ جو رنگ اختیار کرے اسی رنگ میں رنگ جاؤ؟ اگر مدّعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے نزول اور کسی نبی کی

بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہوا کی موجیں تمہاری ہدایت کے لیے اور حیاتِ دنیا کا بہاؤ تمہاری رہنمائی کے لیے اور زمانہ کی نیرنگیاں تمہیں گرگٹ کی روش سکھانے کے لیے کافی تھیں۔ خدا نے کوئی کتاب ایسی ناپاک تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجی اور نہ اس غرض کے لیے کوئی نبی مبعوث کیا۔ اس ذاتِ حق کی طرف سے تو جو پیغام بھی آیا ہے، اس لیے آیا ہے کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہے ان سب کو چھوڑ کر ایک سیدھا راستہ مقرر کرے، اس کے خلاف جتنے راستے ہوں ان کو مٹائے اور دنیا کو ان سے مٹانے کی کوشش کرے، ایمان داروں کی ایک جماعت بنائے جو نہ صرف خود اس سیدھے راستے پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف کھینچ کر لانے کی کوشش کریں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے ہمیشہ اسی غرض کے لیے جہاد کیا ہے۔ اس جہاد میں اذیتیں اٹھائی ہیں۔ نقصان برداشت کیے ہیں اور جانیں دی ہیں۔ ان میں سے کسی نے مصائب کے خوف یا منافع کے لالچ سے رفتارِ زمانہ کو کبھی اپنا مقتدا نہیں بنایا۔ اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ہدایتِ آسمانی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں نقصان اور مشکلات اور خطرات دیکھتا ہے اور ان سے خوف زدہ ہو کر کسی ایسے راستے پر جانا چاہتا ہے جس پر چلنے والے اس کو خوش حال، کامیاب اور سربلند نظر آتے ہیں تو وہ شوق سے اپنے پسندیدہ راستے پر جائے۔ مگر وہ بزدل اور حریص انسان اپنے نفس کو اور دنیا کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے نبیؐ کے بتائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر بھی اس کا پیرو ہے؟ نافرمانی خود ایک بڑا جرم ہے۔ اس پر جھوٹ اور فریب اور منافقت کا اضافہ کر کے آخر کیا فائدہ اٹھانا مقصود ہے؟

یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رخ پر بہہ گیا ہے اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا، عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں، سینکڑوں انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام ہی میں موجود ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا یہ دریا کس رخ پر بہہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغ دار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر فواحش، معاشرت پر نفس پرستی، معیشت پر ظالمانہ جاگیرداری و سرمایہ داری، اور قانون پر بے اعتدالی کا تسلط نہ تھا؟ مگر ایک تنِ واحد نے اٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دے دیا، تمام ان غلط خیالات اور غلط طریقوں کو رد کر دیا جو

اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ ان سب کے مقابلے میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا، اور چند سال کی مختصر مدت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دنیا کے رخ کو پھیر کر اور زمانے کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

تازہ ترین مثال اشتراکی تحریک کی ہے، انیسویں صدی میں سرمایہ داری کا تسلط اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کوئی بزدل مرغِ بادنما اس وقت یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ جو نظام ایسی ہول ناک سیاسی اور جنگی قوت کے ساتھ دنیا پر مسلط ہے اس کو الٹ دینا بھی ممکن ہے۔ مگر ان ہی حالات میں ایک شخص کارل مارکس نامی اٹھا اور اس نے اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ حکومتوں نے اس کی مخالفت کی، وطن سے نکالا گیا۔ ملک ملک کی خاک چھانتا پھرا، تنگ دستی اور مصیبت سے دوچار ہوا، مگر مرنے سے پہلے اشتراکیوں کی ایک طاقت ور جماعت پیدا کر گیا۔ جس نے چالیس سال کے اندر نہ صرف روس کی سب سے زیادہ خوف ناک طاقت کو الٹ کر رکھ دیا بلکہ تمام دنیا میں سرمایہ داری کی جڑیں ہلا دیں اور اپنا ایک معاشی اور تمدنی نظریہ اس قوت کے ساتھ پیش کیا کہ آج دنیا میں اس کے متبعین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے اور ان ممالک کے قوانین بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن پر سرمایہ داری کی حکومت گہری جڑوں کے ساتھ جمی ہوئی ہے۔

مگر انقلاب یا ارتقاء ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوا ہے، اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں، ڈھال دینے کا نام ہے۔ مڑ جانے کو قوت نہیں کہتے موڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا، جو لوگ اپنا کوئی اصول، کوئی مقصدِ حیات، کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں، جو بلند مقصد کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جن کو دنیا میں محض آسائش و سہولت ہی مطلوب ہو، جو ہر سانچے میں ڈھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے، ان ہی نے اپنے جہاد اور قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رخ پھیرا ہے۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں۔ مناہجِ عمل میں انقلاب برپا کیا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ کر چھوڑا ہے۔

پس یہ نہ کہو کہ دنیا جس راستہ پر جارہی ہے اس سے وہ پھیری نہیں جا سکتی اور زمانے کی جو روش ہے اس کا اتباع کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ مجبوری کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بجائے تم کو خود

اپنی کمزوری کا سچا اعتراف کرنا چاہیے اور جب تم اس کا اعتراف کرلو گے تو تم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کمزور کے لیے دنیا میں نہ کوئی مذہب ہوسکتا ہے، نہ کوئی اصول اور نہ کوئی ضابطہ۔ اس کو ہر زور آور سے دبنا پڑے گا۔ ہر طاقت ور کے آگے جھکنا پڑے گا۔ وہ اپنے کسی اصول اور کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی مذہب اس کے لیے اپنے اصول بدلتا چلا جائے تو وہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہ رہے گا۔

یہ بھی ایک دھوکا ہے کہ اسلام کی قیود تمہاری خوش حالی اور ترقی میں مانع ہیں۔ آخر تم اسلام کی کس قید کی پابندی کر رہے ہو؟ کون سی قید ہے جس سے تم آزاد نہیں ہوئے؟ اور کون سی حد ہے جس کو تم نے نہیں توڑا؟ تم کو جو چیزیں تباہ کر رہی ہیں ان میں سے کس کی اجازت اسلام نے تم کو دی تھی۔ تم تباہ ہو رہے ہو اپنی فضول خرچیوں سے جن کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ کا سود تمہاری جیبوں سے ساہوکاروں کے خزانہ میں جا رہا ہے اور کروڑوں روپے کی جائیدادیں تمہارے قبضہ سے نکلتی جا رہی ہیں، کیا اسلام نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ تم کو خود تمہاری اپنی بُری عادتیں تباہ کر رہی ہیں۔ اس مفلسی کی حالت میں بھی سنیما اور کھیل تماشے تمہاری آبادی سے بھرے رہتے ہیں۔ تم میں کا ہر شخص لباس اور زینت و آرائش کے سامانوں پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ تمہاری جیبوں سے ہر مہینے لکھوکھا روپیہ بیہودہ رسموں اور نمائشی افعال اور جاہلانہ اشغال میں صرف ہوجاتا ہے۔ ان میں سے کس کو اسلام نے تمہارے لیے حلال کیا تھا؟ سب سے بڑی چیز جس نے تم کو تباہ کر دیا ہے وہ ادائے زکوٰۃ میں غفلت اور آپس کی معاونت سے بے پروائی ہے۔ کیا اسلام نے یہ چیز تم پر فرض نہ کی تھی؟ پس حقیقت یہ ہے کہ تمہاری معیشت کی بربادی اسلامی قیود کی پابندی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اُن سے آزادی کا نتیجہ ہے۔ رہی ایک سود کی پابندی تو وہ بھی کہاں قائم ہے؟ کم از کم ۹۵ فی صدی مسلمان بغیر کسی حقیقی مجبوری کے سود پر قرض لیتے ہیں۔ کیا اسلامی احکام کی پابندی اسی کا نام ہے۔ مال دار مسلمانوں میں سے بھی ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں سود کھا ہی رہا ہے۔ باقاعدہ ساہوکاری نہ کی تو کیا ہوا، بینک اور بیمہ اور سرکاری بانڈس اور پراویڈنٹ فنڈس کا سود تو اکثر و بیشتر مال دار مسلمان کھاتے ہیں۔ پھر وہ حرمتِ سود کی قید کہاں ہے، جس پر تم اپنی معاشی خستہ حالی کا الزام رکھتے ہو؟

عجیب پُرلطف استدلال ہے کہ مسلمانوں کی عزت اور قومی طاقت کا مدار دولت مندی

پر ہے اور دولت کا مدار معاشی ترقی و خوش حالی کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے پر ہے، اور ان سب کا مدار سود کے جواز پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ابھی تک یہی خبر نہیں کہ عزت اور طاقت کا مدار دراصل کس چیز پر ہے؟ محض دولت ہرگز وہ چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو معزز اور طاقت ور بناتی ہو، تمہارا ایک ایک شخص اگر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جائے مگر تم میں کیریکٹر کی طاقت نہ ہو تو یقین رکھو کہ دنیا میں تمہاری کوئی عزت نہ ہوگی۔ بہ خلاف اس کے اگر تم میں درحقیقت اسلامی سیرت موجود ہو، تم صادق اور امین ہو، لالچ اور خوف سے پاک ہو، اپنے اصول میں سخت اور اپنے معاملات میں کھرے ہو، حق کو حق اور فرض کو فرض سمجھنے والے ہو، حرام و حلال کی تمیز کو ہر حال میں ملحوظ رکھنے والے ہو اور تم میں اتنی اخلاقی قوت موجود ہو کہ کسی نقصان کا خوف اور کسی فائدے کی طمع تم کو راستی سے نہ ہٹا سکے اور کسی قیمت پر تمہارا ایمان نہ خریدا جاسکے تو دنیا میں تمہاری ساکھ قائم ہوجائے گی۔ دلوں میں تمہاری عزت بیٹھ جائے گی۔ تمہاری بات کا وزن لکھ پتی کی پوری دولت سے زیادہ ہوگا۔ تم جھونپڑیوں میں رہ کر اور پیوند کے کپڑے پہن کر بھی دولت سراؤں میں رہنے والوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاؤ گے اور تمہاری قوم کو ایسی طاقت حاصل ہوگی جس کو کبھی نیچا نہیں دکھایا جاسکتا۔ عہدِ صحابہ کے مسلمان کس قدر مفلس تھے، جھونپڑیوں اور کمبل کے خیموں میں رہنے والے، تمدن کی شان و شوکت سے ناآشنا، نہ ان کے پاس لباس درست، نہ غذا درست، نہ ہتھیار درست، نہ سواریاں شان دار، مگر ان کی جو دھاک اور ساکھ دنیا میں تھی وہ نہ اموی عہد میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی، نہ عباسی عہد میں اور نہ بعد کے کسی عہد میں۔ ان کے پاس دولت نہ تھی مگر کیریکٹر کی طاقت تھی جس نے دنیا میں اپنی عزت اور عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ بعد والوں کے پاس دولت آئی، حکومت آئی، تمدن کی شان و شوکت آئی مگر کوئی چیز بھی کیریکٹر کی کمزوری کا بدل فراہم نہ کرسکی۔

تم نے تاریخِ اسلام کا سبق تو فراموش ہی کر دیا ہے، مگر دنیا کی جس قوم کی تاریخ چاہو اٹھا کر دیکھ لو، تم کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ کسی قوم نے محض سہولت پسندی اور آرام طلبی اور منفعت پرستی سے عزت اور طاقت حاصل کی ہو۔ تم کسی ایسی قوم کو معزز اور سربلند نہ پاؤ گے جو کسی اصول اور ڈسپلن کی پابند نہ ہو۔ کسی بڑے مقصد کے لیے تنگی اور مشقت اور سختی نہ برداشت کرسکتی ہو اور اپنے اصول و مقاصد کے لیے اپنے نفس کی خواہشات کو اور خود اپنے نفس کو بھی قربان

کر دینے کا جذبہ نہ رکھتی ہو۔ یہ ڈسپلن اور اصولوں کی پابندی اور بڑے مقاصد کے لیے راحت و آسائش اور منافع کی قربانی کسی نہ کسی رنگ میں تم کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ اسلام میں اس کا رنگ کچھ اور ہے اور دوسری ترقی یافتہ قوموں میں کچھ اور۔ یہاں سے نکل کر تم کسی اور نظامِ تمدن میں جاؤ گے۔ تو وہاں بھی تم کو اس رنگ میں نہ سہی کسی دوسرے رنگ میں ایک نہ ایک ضابطہ کا پابند ہونا پڑے گا۔ ایک نہ ایک ڈسپلن کی گرفت برداشت کرنی ہی ہوگی۔ چند مخصوص اصولوں کے شکنجے میں بہ ہر حال تم جکڑے جاؤ گے، اور تم سے کسی مقصد اور کسی اصول کی خاطر قربانی کا مطالبہ ضرور کیا جائے گا۔ اگر اس کا حوصلہ تم میں نہیں ہے۔ اگر تم صرف نرمی اور کشادگی اور مٹھاس ہی کے متوالے ہو، اور کسی سختی، کسی کڑواہٹ کو گوارا کرنے کی طاقت تم میں نہیں ہے تو اسلام کی قید و بند سے نکل کر جہاں چاہو جا کر دیکھ لو۔ کہیں تم کو عزت کا مقام نہ ملے گا اور کسی جگہ طاقت کا خزانہ تم نہ پا سکو گے۔

قرآن نے اس قاعدۂ کلیہ کو صرف چار لفظوں میں بیان کیا ہے اور وہ چار لفظ ایسے ہیں جن کی صداقت پر پوری تاریخِ عالم گواہ ہے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الم نشرح: ۶) یُسر کا دامن ہر حال میں عُسر کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس میں عُسر کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں وہ کبھی یُسر سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

(ترجمان القرآن صفر ۵۵ھ، مئی ۱۹۳۶ء)

مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحۂ عمل

[یہ وہ نوٹ ہے جو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مجلسِ اصلاحِ نصابِ دینیات کے استفسارات کے جواب میں بھیجا گیا تھا، اگرچہ اس میں خطاب بہ ظاہر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ہے لیکن دراصل اس کے مخاطب مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارات ہیں۔ جس تعلیمی پالیسی کی توضیح اس نوٹ میں کی گئی ہے اسے اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہے۔ علی گڑھ ہو یا دیو بند یا ندوہ یا جامعہ ملیہ، سب کا طریقہ کار اب زائد المیعاد ہو چکا ہے۔ اگر یہ اس پر نظرِ ثانی نہ کریں گے تو اپنی افادیت بالکل کھو دیں گے۔]

مسلم یونی ورسٹی کورٹ اس امر پر تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے ادارہ کے بنیادی مقصد یعنی طلباء میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی اور اس کو روبہ عمل لانے کے لیے آپ کی مجلس کا تقرر کیا۔ اس سلسلے میں جو کاغذات یونی ورسٹی کے دفتر سے بھیجے گئے ہیں ان کو میں نے پورے غور و خوض کے ساتھ دیکھا۔ جہاں تک دینیات اور علومِ اسلامیہ کے موجودہ طریقِ تعلیم کا تعلق ہے اس کے ناقابلِ اطمینان ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جو نصاب اس وقت پڑھایا جا رہا ہے وہ یقیناً ناقص ہے لیکن مجلس کے معزز ارکان کی جانب سے جو سوالات مرتب کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس کے پیشِ نظر صرف ترمیمِ نصاب کا سوال ہے، اور غالباً یہ سمجھا جا رہا ہے کہ چند کتابوں کو خارج کر کے چند دوسری کتابیں رکھ دینے سے طلباء میں ''اسلامی اسپرٹ'' پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر میرا قیاس صحیح ہے تو میں کہوں گا کہ یہ اصلی صورتِ حال کا بہت ہی نامکمل اندازہ ہے۔ دراصل ہم کو اس سے زیادہ گہرائی میں جا کر یہ اندازہ کرنا ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد کی اس تعلیم کے باوجود جو

اس وقت دی جا رہی ہے، طلباء میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر محض موجودہ نصابِ دینیات کا نقص ہی اس کی وجہ ہے تو اس نقص کو دور کرنا بلاشبہ اس خرابی کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں، اگر آپ کی پوری تعلیمی پالیسی میں کوئی اساسی خرابی موجود ہے تو اصلاحِ حال کے لیے محض نصابِ دینیات کی ترمیم ہرگز کافی نہ ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا خواہ کتنا ہی محنت طلب اور مشکلات سے لبریز ہو۔ میں نے اس مسئلے پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے اور جن نتائج پر میں پہنچا ہوں انھیں امکانی اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

میرا یہ بیان تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے حصہ میں یونی ورسٹی کی موجودہ تعلیمی پالیسی پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کی اساسی خرابیوں کو واضح کیا جائے گا اور یہ بتایا جائے گا کہ مسلمانوں کے حقیقی مفاد کے لیے اب ہماری تعلیمی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ دوسرے حصہ میں اسلامی تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اور تیسرے حصہ میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر سے بحث کی جائے گی۔

(۱)

اس وقت مسلم یونی ورسٹی میں جو طریقِ تعلیم رائج ہے وہ تعلیم اور جدید اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں پیدا کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں۔ یکجائی و اجتماع کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلباء کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متبائن اور متزاحم عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے۔ اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ قباحت کا سبب بن گئی ہے، کیوں کہ اوّل تو خود آمیزش ہی درست نہیں ہے، پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے۔ اس میں مغربی عنصر بہت طاقت ور اور اسلامی عنصر اس کے مقابلے میں نہایت کم زور ہے۔ مغربی عنصر

کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے۔ جس کی پشت پر رفتارِ زمانہ کی قوت اور ایک عالم گیر حکمراں تمدن کی طاقت ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری یونی ورسٹی کی تعلیم میں ٹھیک اسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونی ورسٹیوں میں ہے اور ہونا چاہیے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ یہاں مغربی علوم وفنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کے صاف اور سادہ لوحِ دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں اور ان کی ذہنیت کلیتاً مغربی سانچے میں ڈھل جاتی ہے حتیٰ کہ وہ مغربی نظر سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز معقول اور باوقعت ہے تو وہی ہے جو مغربی حکمت کے اصول ومبادی سے مطابقت رکھتی ہو۔ پھر ان تاثرات کو مزید تقویت اس تربیت سے پہنچتی ہے جو ہماری یونی ورسٹی میں عملاً دی جا رہی ہے، لباس، معاشرت، آداب واطوار، رفتار وگفتار، کھیل کود، غرض کون سی چیز ایسی ہے جس پر مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہیں ہے۔ یونی ورسٹی کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۵ فی صدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو اثرات ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں ان کو ہر صاحبِ نظر خود سمجھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی عنصر نہایت کم زور ہے۔ اوّل تو وہ اپنی تمدنی وسیاسی طاقت کھو کر ویسے ہی کم زور ہو چکا ہے، پھر ہماری یونی ورسٹی میں اس کی تعلیم جن کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے وہ موجودہ زمانہ سے صدیوں پہلے لکھی گئی تھی۔ ان کی زبان اور ترتیب وتدوین ایسی نہیں جو عصری دماغوں کو اپیل کر سکے۔ اس میں اسلام کے ابدی اصولوں کو جن حالات اور جن عملی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے ان میں سے اکثر درپیش نہیں ہیں اور جو مسائل اب درپیش ہیں ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مزید برآں اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت، کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں۔ اس طرح مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلباء کے دل ودماغ پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آجائے اور اسلامی عنصر محض سامانِ مضحکہ بننے کے لیے رہ جائے یا زیادہ سے زیادہ اس لیے کہ زمانۂ ماضی کے آثارِ باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جائے۔

میں اپنی صاف گوئی پر معافی کا خواستگار ہوں، مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس کو

بے کم و کاست بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں مسلم یونی ورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بہ حیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتاپا غیر مسلم بناتے ہیں، پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں، تاکہ آپ پر اسے غیر مسلم بنانے کا الزام عائد نہ ہو، اور اگر وہ اس بستہ کو اٹھا کر پھینک دے (جس کی وجہ دراصل آپ ہی کی تعلیم ہوگی) تو وہ خود ہی اس فعل کے لیے قابلِ الزام قرار پائے۔ اس طرزِ تعلیم سے اگر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ مسلمان پیدا کرے گا تو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ معجزے اور خرقِ عادت کے متوقع ہیں۔ کیوں کہ آپ نے جو اسباب مہیا کیے ہیں ان سے قانونِ طبیعی کے تحت تو یہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہوسکتا۔ فیصدی ایک دو چار طالب علموں کا مسلمان رہ جانا (کامل اعتقادی و عملی مسلمان) رہ جانا کوئی حجت نہیں۔ یہ آپ کی یونی ورسٹی کے فیضانِ تربیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت جس طرح علی گڑھ کے فارغ التحصیل اصحاب میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح ہندستان کی سرکاری یونیورسٹیوں بلکہ یورپ کی یونیورسٹیوں کے متخرجین میں بھی مل سکتے ہیں۔ جن کے نصاب میں سرے سے کوئی اسلامی عنصر ہے ہی نہیں۔

اب اگر آپ ان حالات اور اس طرزِ تعلیم کو بعینہٖ باقی رکھیں اور محض دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقت ور نصاب شریک کر دیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی۔ ہر طالبِ علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا، جس میں یہ دو طاقتیں پوری قوت کے ساتھ جنگ کریں گی۔ اور بالآخر آپ کے طلباء تین مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

ایک وہ جن پر فرنگیت غالب رہے گی، عام اس سے کہ وہ انگریزیت کے رنگ میں، یا ہندی وطن پرستی کے رنگ میں یا ملحدانہ اشتراکیت کے رنگ میں۔

دوسرے وہ جن پر اسلامیت غالب رہے گی، خواہ اس کا رنگ گہرا ہو یا فرنگیت کے اثر سے پھیکا پڑ جائے۔ تیسرے وہ جو نہ پورے مسلمان ہوں گے نہ پورے فرنگی۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ نتیجہ بھی کوئی خوش گوار نتیجہ نہیں۔ نہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے اس اجتماعِ نقیضین کو مفید کہا جا سکتا ہے اور نہ قومی نقطۂ نظر سے ایسی یونی ورسٹی اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کر سکتی ہے جس کے نتائج دو تہائی حصہ قومی مفاد کے خلاف اور قومی تہذیب کے لیے نقصان

کال کے مترادف ہوں کم از کم مسلمانوں کی غریب قوم کے لیے تو یہ سودا بہت ہی مہنگا ہے کہ وہ ہکھوں روپے کے خرچ سے ایک ایسی ٹکسال جاری رکھے جس میں سے ۳۳ فی صدی سکے تو مستقل طور پر کھوٹے نکلتے رہیں اور ۳۳ فی صدی ہمارے خرچ پر تیار ہو کر غیروں کی گود میں ڈال دیے جائیں، بالآخر خود ہمارے خلاف استعمال ہوں۔

مذکورہ بالا بیان سے دو باتیں اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں:

اولاً تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔

ثانیاً اسلامی مفاد کے لیے بھی ایسی آمیزش کسی طرح مفید نہیں خواہ وہ اس قسم کی غیر مساوی آمیزش ہو جیسی اب تک رہی ہے، یا مساوی کر دی جائے، جیسا کہ اب کرنے کا خیال کیا جا رہا ہے۔

ان امور کی توضیح کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں یونی ورسٹی کی تعلیم یسی اب کیا ہونی چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر یونی ورسٹی کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو نہ آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درس گاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے، جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کی یونی ورسٹی کس کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی؟ اگر وہ مغربی کلچر ہے تو اس کو مسلم یونی ورسٹی نہ کہیے، نہ اس میں دینیات کا ایک نصاب رکھ کر خواہ مخواہ طالب علموں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا نہ کیجیے۔ اور اگر وہ اسلامی کلچر ہے تو آپ کو اپنی پوری یونی ورسٹی کی ساخت بدلنی پڑے گی۔ اور اس کی ہیئت ترکیبی کو ایسے طرز پر ڈھالنا ہوگا کہ وہ بہ حیثیت مجموعی اس کلچر کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مناسب ہو اور نہ صرف اس کا تحفظ کرے بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اچھی طاقت بن جائے۔

جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں، موجودہ حالت میں تو آپ کی یونی ورسٹی اسلامی کلچر کی نہیں بلکہ مغربی کلچر کی خادم بنی ہوئی ہے۔ اس حالت میں اگر صرف اتنا تغیر کیا جائے کہ دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقت ور کیا جائے اور تعلیم و تربیت کے باقی تمام

شعبوں میں پوری مغربیت برقرار ہے تو اس سے بھی یہ درس گاہ اسلامی کلچر کی خادم نہیں بن سکتی۔

اسلام کی حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ دنیوی تعلیم و تربیت اور دینی تعلیم کو الگ کرنا اور ایک دوسرے سے مختلف رکھ کر ان دونوں کو یک جا جمع کر دینا بالکل لا حاصل ہے۔ اسلام مسیحیت کی طرح کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس کا دین دنیا سے کوئی الگ چیز ہو۔ وہ دنیا کو دنیا والوں کے لیے چھوڑ کر صرف اعتقادات اور اخلاقیات کی حد تک اپنے دائرے کو محدود نہیں رکھتا۔ اس لیے مسیحی دینیات کی طرح اسلام کے دینیات کو دنیویات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لیے ایک ایسے طریقے پر تیار کرنا ہے جو اس زندگی سے لے کر آخرت کی زندگی تک سلامتی، عزت اور برتری کا طریقہ ہے، اس غرض کے لیے وہ اس کی نظر و فکر کو درست کرتا ہے۔ اس کے اخلاق کو سنوارتا ہے۔ اس کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس کے لیے حقوق و فرائض متعین کرتا ہے اور اس کو اجتماعی زندگی کا ایک خاص نظام وضع کر کے دیتا ہے۔ افراد کی ذہنی و عملی تربیت، سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور زندگی کے تمام شعبوں کی تربیت و تعدیل کے باب میں اس کے اصول و ضوابط سب سے الگ ہیں۔ انہی کی بدولت اسلامی تہذیب ایک جداگانہ تہذیب کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اور مسلمان قوم کا بہ حیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا انہی کی پابندی پر منحصر ہے۔ پس جب حال یہ ہے تو ''اسلامی دینیات'' کی اصطلاح ہی بے معنی ہو جاتی ہے اگر زندگی اور اس کے معاملات سے اس کا ربط باقی نہ رہے۔ اسلامی کلچر کے لیے وہ عالم دین بے کار ہے جو اسلام کے عقائد و اصول سے واقف ہے۔ مگر ان کو لے کر علم و عمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے دائم التغیر احوال و مسائل میں ان کو برتنا نہیں جانتا۔ اسی طرح اس کلچر کے لیے وہ عالم دنیا بھی بے کار ہے جو دل میں تو اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے مگر دماغ سے غیر اسلامی طریق پر سوچتا ہے۔ معاملات کو غیر اسلامی نظر سے دیکھتا ہے اور زندگی کو غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے زوال اور اسلامی نظام تمدن کی ابتری کا اصلی سبب یہی ہے کہ ایک مدت سے ہماری قوم میں صرف ان ہی دو قسموں کے عالم پیدا ہو رہے ہیں اور دنیوی علم و عمل سے علم دین کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر سے جوان ہو جائے اور زمانہ کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنے لگے تو اس ٹوٹے ہوئے رابطہ کو پھر سے قائم کیجیے۔ مگر اس کو

قائم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ دینیات کے نصاب کو جسم تعلیمی کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشتارہ بنا دیا جائے۔ نہیں، اس کو پورے نظام تعلیم و تربیت میں اس طرح اتار دیجیے کہ وہ اس کا دوران خون، اس کی روحِ رواں، اس کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا شعور و فکر بن جائے اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز و بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ مسلمان فلسفی، مسلمان سائنس داں، مسلمان ماہرینِ معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہرین پیدا کر سکیں گے جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں گے، تہذیب حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیب اسلام کی خدمت لیں گے۔ اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانینِ حیات کو روحِ عصری کے لحاظ سے از سرِ نو مرتب کریں گے۔

یہاں تک کہ اسلام از سرِ نو علم و عمل کے ہر میدان میں اسی امامت و رہنمائی کے مقام پر آ جائے گا، جس کے لیے وہ درحقیقت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ تخیل جو مسلمانوں کی جدید تعلیمی پالیسی کا اساسی تخیل ہونا چاہیے۔ زمانہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکا ہے، جہاں سر سید ہم کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اب اگر زیادہ عرصے تک ہم اس پر قائم رہے تو بہ حیثیت ایک مسلم قوم کے ہمارا ترقی کرنا تو درکنار زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔

(۲)

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اوپر جس تعلیمی پالیسی کا ہیولیٰ میں نے پیش کیا ہے اس کو صورت کا لباس کس طرح پہنایا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلم یونی ورسٹی کے حدود میں ''فرنگیت'' کا کلی استیصال کر دینا نہایت ضروری ہے، اگر ہم اپنی قومی تہذیب کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا نہیں چاہتے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی نئی نسلوں میں ''فرنگیت'' کے ان روز افزوں رجحانات کا سدِ باب کریں۔ یہ رجحانات دراصل غلامانہ ذہنیت اور چھپی ہوئی دنائیت (Interiority Complex) کی پیداوار ہیں۔ پھر جب ان کا عملی ظہور لباس، معاشرت، آداب و اطوار اور بہ حیثیت مجموعی پورے ماحول میں ہوتا ہے تو یہ ظاہر اور باطن دونوں طرف سے نفس کا احاطہ کر لیتے ہیں اور اس میں شرفِ قومی کا رمق برابر احساس نہیں چھوڑتے۔ ایسے حالات میں اسلامی تہذیب کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض اپنے

اصولوں اور اپنے اساسی تصورات کے مجرد ذہنی وجود سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عملی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے نشو ونما پاتی ہے۔ اگر عملی برتاؤ مفقود ہوجائے تو تہذیب اپنی طبعی موت مرجائے گی اور اس کا ذہنی وجود بھی برقرار نہ رہ سکے گا۔ پس سب سے مقدم اصلاح یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ایک زندہ اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔ آپ کی تربیت ایسی ہونی چاہیے جو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی قومی تہذیب پر فخر کرنا سکھائے۔ ان میں اپنی قومی خصوصیات کا احترام بلکہ عشق پیدا کرے۔ ان میں اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کی روح پھونک دے۔ اس کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے علم اور اپنی تربیت یافتہ ذہنی صلاحیتوں سے اپنے قومی تمدن کو شائستگی کے بلند مدارج کی طرف لے چلیں۔

(۲) اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم وعمل پر ہے۔ جو معلم خود اس روح سے خالی ہیں، بلکہ خیال اور عمل میں ان دونوں کے مخالف ہیں ان کے زیر اثر رہ کر معلمین میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ آپ محض عمارت کا نقشہ بنا سکتے ہیں، مگر اصلی معمار آپ نہیں، آپ کے تعلیمی اسٹاف کے ارکان ہیں۔ ''فرنگی'' معماروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرزِ تعمیر پر عمارت بنائیں گے، کریلے کے بیل سے خوشۂ انگور کی امید رکھنا ہے۔ محض دینیات کے لیے چند ''مولوی'' رکھ لینا ایسی صورت میں بالکل فضول ہوگا جب کہ دوسرے تمام یا اکثر علوم کے پڑھانے والے غیر مسلم یا ایسے مسلمان ہوں جن کے خیالات غیر اسلامی ہوں۔ کیونکہ وہ زندگی اور اس کے مسائل اور معاملات کے متعلق طلباء کے نظریات اور تصورات کو اسلام کے مرکز سے پھیر دیں گے اور اس زہر کا تریاق محض دینیات کے کورس سے فراہم نہ ہوسکے گا۔ لہٰذا خواہ کوئی فن ہو، فلسفہ ہو یا سائنس، معاشیات ہو یا قانون، تاریخ ہو یا کوئی اور علم، مسلم یونیورسٹی میں اس کی پروفیسری کے لیے کسی شخص کا ماہرِ فن ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔ اگر مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہر فن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن عام قاعدہ یہی ہونا چاہیے کہ ہماری یونی ورسٹی کے پروفیسر وہ لوگ ہوں جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ یونی ورسٹی کے اساسی مقصد یعنی اسلامی کلچر کے لیے خیالات اور اعمال کے لحاظ سے مفید ہوں۔

(۳) یونی ورسٹی کی تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔

ہماری کلچر کی زبان ہے۔ اسلام کے مآخذِ اصلیہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن وسنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل نہ کرے گا اسلام کی روح کو نہ پا سکے گا۔ نہ اسلام میں بصیرت حاصل کرسکے گا۔ وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا۔ اور اس طرح آفتاب کی روشنی اس کو براہِ راست آفتاب سے کبھی نہ مل سکے گی۔ بلکہ مختلف قسم کے رنگین آئینوں کے واسطے ہی سے ملتی رہے گی۔ آج ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلامی مسائل میں ایسی ایسی غلطیاں کررہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے۔ آگے چل کر پراونشل اٹانومی کے دور میں جب ہندستان کی مجالسِ مقنّنہ کو قانون سازی کے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہوں گے اور سوشل ریفارم کے لیے نئے نئے قوانین بنائے جانے لگیں گے، اس وقت اگر مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کرتے رہے جو اسلام سے ناواقف ہوں اور اخلاق، معاشرت اور قانون کے مغربی تصورات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو جدید قانون سازی سے مسلمانوں میں سوشل ریفارم ہونے کے بجائے الٹی سوشل ڈیفارم ہوگی اور مسلمانوں کا اجتماعی نظام اپنے اصولوں سے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ پس عربی زبان کے مسئلے کو محض ایک زبان کا مسئلہ نہ سمجھیے بلکہ یوں سمجھیے کہ آپ کی یونیورسٹی کے اساسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے اور جو چیز اساسیات (Fundamentals) سے تعلق رکھتی ہو اس کے لیے سہولت کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر حال میں اس کی جگہ نکالنی پڑتی ہے۔

(۴) ہائی اسکول کی تعلیم میں طلبہ کو حسبِ ذیل مضامین کی ابتدائی معلومات حاصل ہونی چاہییں۔

الف۔ عقائد: اس مضمون میں عقائد کی خشک کلامی تفصیلات نہ ہونی چاہییں بلکہ ایمانیات کو ذہن نشین کرنے کے لیے نہایت لطیف اندازِ بیان اختیار کرنا چاہیے جو فطری وجدان اور عقل کو اپیل کرنے والا ہو۔ طلباء کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے ایمانیات دراصل کائنات کی بنیادی صداقتیں ہیں اور یہ صداقتیں ہماری زندگی سے ایک گہرا ربط رکھتی ہیں۔

ب۔ اسلامی اخلاق: اس مضمون میں مجرد اخلاقی تصورات پیش نہ کیے جائیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ایسے واقعات لے کر

جمع کیے جائیں جن سے طلباء کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کے کیرکٹر کی خصوصیات کیا ہیں اور مسلمان کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ج۔ احکامِ فقہ: اس مضمون میں اللہ اور حقوق العباد کے متعلق اسلامی قانون کے ابتدائی اور ضروری احکام بیان کیے جائیں جن سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے، مگر اس قسم کی جزئیات اس میں نہ ہونی چاہئیں جیسے ہماری فقہ کی پرانی کتابوں میں آتے ہیں کہ مثلاً کنوئیں میں چوہا گر جائے تو کتنے ڈول نکالے جائیں۔ ان چیزوں کے بجائے عبادات اور احکام کی معنویت، ان کی روح اور ان کے مصالح طلباء کے ذہن نشین کرنے چاہئیں۔ ان کو یہ بتانا چاہیے کہ اسلام تمہارے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کیا پروگرام بناتا ہے اور یہ پروگرام کس طرح ایک صالح سوسائٹی کی تخلیق کرتا ہے۔

د۔ اسلامی تاریخ: یہ مضمون صرف سیرتِ رسولؐ اور دورِ صحابہؓ تک محدود رہے۔ اس کے پڑھانے کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ طلباء اپنے مذہب اور اپنی قومیت کی اصل سے واقف ہو جائیں اور ان کے دلوں میں اسلامی حمیت کا احساس پیدا ہو۔

ر۔ عربیت: عربی زبان کا محض ابتدائی علم جو ادب سے ایک حد تک مناسبت پیدا کر دے۔

س۔ قرآن: صرف اتنی استعداد کہ لڑکے کتاب اللہ کو روانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ سادہ آیتوں کو کسی حد تک سمجھ سکیں۔ اور چند سورتیں بھی ان کو یاد ہوں۔

(۵) کالج کی تعلیم میں ایک نصابِ عام ہونا چاہیے جو تمام طلباء کو پڑھایا جائے۔ اس نصاب میں حسبِ ذیل مضامین ہونے چاہئیں۔

الف۔ عربیت: انٹرمیڈیٹ میں عربی ادب کی متوسط تعلیم ہو، بی اے میں پہنچ کر اس مضمون کو تعلیمِ قرآن کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔

ب۔ قرآن: انٹرمیڈیٹ میں طلباء کو فہمِ قرآن کے لیے مستعد کیا جائے۔ اس مرحلے میں صرف چند مقامات ذہن نشین کرا دینے چاہئیں۔ قرآن کا محفوظ اور تاریخی حیثیت سے معتبر ترین کتاب ہونا۔ اس کا وحی الٰہی ہونا۔ تمام مذاہب کی اساسی کتابوں کے مقابلے میں اس کی فضیلت، اس کی بے نظیر انقلاب انگیز تعلیم، اس کے اثرات نہ صرف عرب پر بلکہ تمام دنیا کے افکار اور قوانینِ حیات پر، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ استدلال، اس کا

حقیقی مدّعا (Thesis)۔ بی۔اے میں اصل قرآن کی تعلیم دی جائے۔ یہاں طرزِ تعلیم یہ ہونا چاہیے کہ طلباء خود قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں اور استادان کی مشکلات کو حل اور ان کے شبہات کو رفع کرتا جائے۔ اگر مفصل تفسیر اور جزئی بحثوں سے اجتناب ہو اور صرف مطالب کی توضیح پر اکتفا کیا جائے تو دو سال میں بہ آسانی پورا قرآن پڑھایا جا سکتا ہے۔

ج۔ تعلیماتِ اسلامی: اس مضمون میں طلباء کو پورے اسلامی نظام سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے، ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے۔ پھر اس سوسائٹی کی زندگی کو وہ معاشرت، معیشت، سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات میں کن اصولوں پر منظم کرتا ہے۔ اس کے اجتماعی نظام میں فرد اور جماعت کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کس ڈھنگ پر کی گئی ہے۔ حدود اللہ کیا ہیں۔ ان حدود کے اندر مسلمان کو کس حد تک فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے اور ان حدود کے باہر قدم نکالنے سے نظامِ اسلامی پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور جامعیت کے ساتھ نصاب میں لائے جائیں اور اس کو چار سالہ مدارجِ تعلیمی پر ایک مناسبت کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے۔

(۶) نصابِ عام کے بعد علومِ اسلامیہ کو تقسیم کر کے مختلف علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم میں پھیلا دیجیے اور ہر فن میں اسی فن کی مناسبت سے اسلام کی تعلیمات کو پیوست کیجیے۔ مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ دشمنی نہیں بلکہ ایجاباً میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک حقائقِ علمیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں۔ دشمنی دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ مغربیت اور اسلام میں ہے۔ اکثر علوم میں اہل مغرب اپنے چند مخصوص اساسی تصورات، بنیادی مفروضات (Hypothesis)، نقطہ ہائے آغاز (Starting Points) اور زاویہ ہائے نظر رکھتے ہیں جو بذاتِ خود ثابت شدہ حقائق نہیں ہیں بلکہ محض ان کے اپنے وجدانیات ہیں۔ وہ حقائق علمیہ کو اپنے وجدانیات کے سانچے میں ڈالتے ہیں اور اس سانچے کی مناسبت سے ان کو مرتب کر کے ایک مخصوص نظام بنا لیتے ہیں۔ اسلام کی دشمنی دراصل ان ہی وجدانیات سے ہے، وہ حقائق کا دشمن نہیں بلکہ اس وجدانی سانچے کا دشمن ہے

جس میں ان حقائق کو ڈھالا اور مرتب کیا جاتا ہے۔ وہ خود اپنا ایک مرکزی تصور، ایک زاویۂ نظر، ایک نقطۂ آغازِ فکر، ایک وجدانی سانچہ رکھتا ہے جو اپنی اصل اور فطرت کے اعتبار سے مغربی سانچوں کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ضلالت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مغربی علوم وفنون سے حقائق لیتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ آپ مغرب ہی سے اس کا وجدانی سانچہ بھی لے لیتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ، قانون، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علمی شعبوں میں آپ خود ہی تو اپنے نوجوان اور خالی الذہن طلباء کے دماغوں میں مغرب کے اساسی تصورات بٹھاتے ہیں، ان کی نظر کا فوکس مغربی زاویۂ نظر کے مطابق جماتے ہیں، مغربی مفروضات کو مسلمات بناتے ہیں، استدلال واستشہاد اور تحقیق وتجسس کے لیے صرف وہی ایک نقطۂ آغاز ان کو دیتے ہیں جو اہلِ مغرب نے اختیار کیا ہے اور تمام علمی حقائق اور مسائل کو اسی طرز پر مرتب کر کے ان کے ذہن میں اتار دیتے ہیں جس طرز پر اہل مغرب نے ان کو مرتب کیا ہے، اس کے بعد آپ چاہتے ہیں کہ تنہا دینیات کا شعبہ انھیں مسلمان بنا دے، یہ کس طرح ممکن ہے؟ وہ شعبۂ دینیات کیا کر سکتا ہے، جس میں مجرد تصورات ہوں۔ حقائقِ علمیہ اور مسائلِ حیات پر ان تصورات کا انطباق نہ ہو بلکہ طلباء کے ذہن میں جملہ معلومات کی ترتیب ان تصورات کے بالکل برعکس ہو؟ یہی گمراہی کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ گمراہی کا سدِ باب کرنا چاہتے ہیں تو اس سرچشمہ کے مصدر پر پہنچ کر اس کا رخ پھیر دیجیے اور تمام علمی شعبوں کو وہ نقطۂ آغاز، وہ زاویۂ نظر، وہ اساسی اصول دیجیے جو قرآن نے آپ کو دیے ہیں۔ جب اس وجدانی سانچہ میں معلومات مرتب ہوں گی اور اس نظر سے کائنات اور زندگی کے مسائل کو حل کیا جائے گا۔ تب آپ کے طلباء ''مسلم طلباء'' بنیں گے اور آپ کہہ سکیں گے کہ ہم نے ان میں ''اسلامی اسپرٹ'' پیدا کی۔ ورنہ ایک شعبہ میں اسلام اور باقی تمام شعبوں میں غیر اسلام رکھ دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ کے فارغ التحصیل طلباء فلسفہ میں غیر مسلم، سائنس میں غیر مسلم، قانون میں غیر مسلم، سیاسیات میں غیر مسلم، فلسفۂ تاریخ میں غیر مسلم، معاشیات میں غیر مسلم ہوں گے اور ان کا اسلام محض چند اعتقادات اور چند مذہبی مراسم کی حد تک محدود رہ جائے گا۔

(۷) بی، ٹی، ایچ اور ایم ٹی ایچ کے امتحانات کو بند کر دیجیے۔ نہ ان کی کوئی ضرورت ہے نہ فائدہ۔ جہاں تک علومِ اسلامیہ کے مخصوص شعبوں کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک شعبے کو اسی

کے مماثل علم کے مغربی شعبہ کے انتہائی کورس میں داخل کر دیجیے۔ مثلاً فلسفہ میں حکمت اسلامیہ اور اسلامی فلسفہ کی تاریخ اور فلسفیانہ افکار کے ارتقاء میں مسلمانوں کا حصہ، تاریخ میں تاریخِ اسلام اور اسلامی فلسفۂ تاریخ، قانون میں اسلامی قانون کے اصول اور فقہ کے وہ ابواب جو معاملات سے متعلق ہیں، معاشیات میں اسلامی معاشیات کے وہ اصول اور فقہ کے وہ حصے جو معاشی مسائل سے متعلق ہیں۔ سیاسیات میں اسلام کے نظریاتِ سیاسی اور اسلامی سیاسیات کے نشو وارتقاء کی تاریخ اور دنیا کے سیاسی افکار کی ترقی میں اسلام کا حصہ۔ وقس علیٰ ھٰذا۔

(۸) اس کورس کے بعد علوم اسلامیہ میں ریسرچ کے لیے ایک مستقل شعبہ ہونا چاہیے جو مغربی یونی ورسٹیوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی علمی تحقیق پر سندِ فضیلت (Doctorate) دیا کرے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مجتہدانہ طرزِ تحقیق کی تربیت پا کر نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام دنیا کی نظری وفکری رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

(۳)

حصہ دوم میں جس طرزِ تعلیم کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے وہ بظاہر نا قابلِ عمل معلوم ہوتا ہے لیکن میں کافی غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ توجہ اور محنت اور صرفِ مال سے اس کو بتدریج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آپ کسی راہ میں پہلا قدم اٹھاتے ہی منزل کے آخری نشان پر نہیں پہنچ سکتے۔ کام کی ابتدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کی تکمیل کا پورا سامان پہلے سے آپ کے پاس موجود ہو ابھی تو آپ کو صرف عمارت کی بنیاد رکھنی ہے اور اس کا سامان اس وقت فراہم ہو سکتا ہے۔ موجودہ نسل میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو اس طرزِ تعمیر پر بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت سے جو نسل اٹھے گی وہ دیواریں اٹھانے کے قابل ہوگی۔ پھر تیسری نسل ایسی نکلے گی جس کے ہاتھوں یہ کام ان شاء اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ جو درجۂ کمال کم از کم تین نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد حاصل ہو سکتا ہے اس کو آج ہی حاصل کر لینا ممکن نہیں لیکن تیسری نسل میں عمارت کی تکمیل تب ہی ہو سکے گی کہ آپ آج اس کی بنیاد رکھ دیں۔ ورنہ اگر اس کے درجۂ کمال کو اپنے سے دور پا کر آپ نے آج سے اس کی ابتدا ہی نہیں کی حالاں کہ ابتدا کرنے کے اسباب آپ کے پاس موجود ہیں تو یہ کام کبھی انجام نہ پائے گا۔

چونکہ میں اس اصلاحی اقدام کا مشورہ دے رہا ہوں اس لیے یہ بھی میرا فرض ہے کہ اس کو عمل میں لانے کی تدابیر بھی پیش کروں۔ اپنے بیان کے اس حصہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرزِ تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے قابلِ عمل تدبیریں کیا ہیں۔

(۱) ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے عقائد، اسلامی اخلاق اور احکام شریعت کا ایک جامع کورس حال ہی میں سرکار نظام کے محکمۂ تعلیمات نے تیار کرایا ہے۔ اس کو ضروری ترمیم واصلاح سے بہت کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

عربی زبان کی تعلیم قدیم طرز کی وجہ سے جس قدر ہولناک ہوگئی تھی الحمدللہ کہ اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔ اس کے لیے جدید طریقے مصروشام اور خود ہندستان میں ایسے نکل آئے ہیں جن سے بآسانی یہ زبان سکھائی جاتی ہے۔

ایک خاص کمیٹی ان لوگوں کی مقرر کی جائے جو عربی تعلیم کے جدید طریقوں میں علمی و عملی مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مشورے سے ایک ایسا کورس تجویز کیا جائے جس میں زیادہ تر قرآن ہی کو عربی کی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ اس طرح تعلیم قرآن کے لیے الگ وقت نکالنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی اور ابتدا ہی سے طلباء کو قرآن سے مناسبت پیدا ہوجائے گی۔

اسلامی تاریخ کے بہ کثرت رسالے اردو زبان میں لکھے جاچکے ہیں۔ ان کو جمع کر کے بہ نظرِ غور دیکھا جائے اور جو رسائل مفید پائے جائیں ان کو ابتدائی جماعتوں کے کورس میں داخل کرلیا جائے۔

مقدم الذکر دونوں مضامین کے لیے روزانہ صرف ایک گھنٹہ کافی ہوگا۔ رہی اسلامی تاریخ تو یہ مضمون کوئی الگ وقت نہیں چاہتا۔ تاریخ کے عمومی نصاب میں اس کو ضم کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کوئی زیادہ تغیر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی، تغیر کی ضرورت جو کچھ بھی ہے نصابِ تعلیم اور تعلیمی اسٹاف میں ہے۔ دینیات کی تدریس اور اس کے درس کا جو تصور آپ کے ذہن میں اب تک رہا ہے اس کو نکال دیجیے۔ اس دور کے لڑکوں اور لڑکیوں کی ذہنیت اور ان کے نفسیات کو سمجھنے والے مدرس رکھیے۔ ان کو ایک ترقی یافتہ نصابِ تعلیم دیجیے اور اس کے ساتھ ایسا ماحول پیدا کیجیے جس میں ''اسلامیت'' کے بیج کو بالیدگی نصیب ہوسکے۔

(۲) کالج کے لیے نصابِ عام کی تجویز میں نے پیش کی ہے اس کے تین اجزا ہیں:
(الف) عربیت (ب) قرآن (ج) تعلیماتِ اسلامی۔

ان میں سے عربیت کو آپ ثانوی لازمی زبان کی حیثیت دیجیے۔ دوسری زبانوں میں سے کسی کی تعلیم اگر طلباء حاصل کرنا چاہیں تو ٹیوٹرس کے ذریعہ سے حاصل کرسکتے ہیں مگر کالج میں جو زبان ذریعۂ تعلیم ہے اس کے بعد صرف عربی زبان ہی لازمی ہونی چاہیے۔ اگر نصاب اچھا ہو اور پڑھانے والے آزمودہ کار ہوں تو انٹرمیڈیٹ کے دو سالوں میں طلباء کے اندراتنی استعداد پیدا کی جاسکتی ہے کہ وہ بی۔اے میں پہنچ کر قرآن کریم کی تعلیم خود قرآن کی زبان میں حاصل کرسکیں۔

قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلباء کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا۔ پھر بی۔اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھادے گا کہ وہ عربیت میں کافی ترقی کرجائیں گے اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہوجائیں گے۔

تعلیماتِ اسلامی کے لیے ایک جدید کتاب لکھوانے کی ضرورت ہے جو ان مقاصد پر حاوی ہو، جن کی طرف میں نے حصہ دوم کے نمبر ۵ ضمن (ج) میں اشارہ کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے خود ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ایک کتاب ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' کے عنوان سے لکھنی شروع کی تھی جس کے ابتدائی تین باب ''ترجمان القرآن'' میں محرم ۵۲ھ سے شعبان ۵۳ھ تک کے پرچوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر اس کو مفید سمجھا جائے تو میں اس کی تکمیل کر کے یونی ورسٹی کی نذر کردوں گا۔[۱]

ان مضامین کے لیے کالج کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کسی تغیر کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔
عربیت کے لیے وہی وقت کافی ہوسکتا ہے جو آپ کے ہاں دینیات کے لیے مقرر ہے۔

(۳) زیادہ تر مشکل اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آئے گی جسے میں نے حصہ دوم کے نمبر ۶، ۷ میں پیش کیا ہے۔ اس کے حل کی تین صورتیں ہیں جن کو بتدریج اختیار کیا جاسکتا ہے۔

الف۔ ایسے پروفیسر تلاش کیے جائیں (اور وہ ناپید نہیں ہیں) جو علوم جدیدہ کے ماہر

(۱) ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی'' کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہے۔

ہونے کے ساتھ قرآن اور سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں جن میں اتنی اہلیت ہو کہ مغربی علوم کے حقائق کو ان کے نظریات اور ان کی وجدانی اساس سے الگ کر کے اسلامی اصول و نظریات کے مطابق مرتب کر سکیں۔

ب۔ اسلامی فلسفۂ قانون، اصولِ قانون و فلسفۂ تشریح، سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، تاریخ و فلسفۂ تاریخ وغیرہ کے متعلق عربی، اردو، انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں جس قدر لٹریچر موجود ہے اس کی چھان بین کی جائے، جو کتابیں بعینہٖ لینے کے قابل ہوں ان کا انتخاب کر لیا جائے اور جن کو اقتباس یا حذف و ترمیم کے ساتھ کار آمد بنایا جا سکتا ہو، ان کو اسی طریق پر کام میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے اہلِ علم کی ایک خاص جمعیت مقرر کرنی ہوگی۔

ج۔ چند ایسے فضلاء کی خدمات حاصل کی جائیں جو مذکورہ بالا علوم پر جدید کتابیں تالیف کریں۔ خصوصیت کے ساتھ اصولِ فقہ، احکامِ فقہ، اسلامی معاشیات، اسلام کے اصولِ عمران، حکمتِ قرآنیہ پر جدید کتابیں لکھنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ قدیم کتابیں اب درس و تدریس کے لیے کار آمد نہیں ہیں۔ اربابِ اجتہاد کے لیے تو بلاشبہ انھیں بہت اچھا مواد مل سکتا ہے۔ مگر جوں کا توں لے کر موجودہ زمانے کے طلباء کو پڑھانا بالکل بے سود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرِ دست ان تینوں تدبیروں سے وہ مقصد بدرجۂ کمال حاصل نہ ہوگا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ بلاشبہ اس تعمیرِ جدید میں بہت کچھ نقائص پائے جائیں گے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ صحیح راستہ پر پہلا قدم ہوگا۔ اس میں جو کچھ کوتاہیاں رہ جائیں گی ان کی بعد کی نسلیں پورا کریں گی۔ یہاں تک کہ اس کے تکمیلی ثمرات کم از کم پچاس سال بعد ظاہر ہوں گے۔

(۴) اسلامی ریسرچ کا شعبہ قائم کرنے کا ابھی موقع نہیں۔ اس کی نوبت چند سال بعد آئے گی۔ اس لیے اس کے متعلق تجاویز پیش کرنا قبل از وقت ہے۔

(۵) میری تجاویز میں فرقی اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ تاہم اس باب میں علمائے شیعہ سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ کس حد تک اس طرزِ تعلیم میں شیعہ طلباء کو سنی طلباء کے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔ اگر وہ چاہیں تو شیعہ طلباء کے لیے خود کوئی اسکیم مرتب کریں، مگر مناسب یہ ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے تعلیم میں فروعی اختلافات کو کم سے کم جگہ دی جائے اور مختلف فرقوں کی آئندہ نسلوں کو اسلام کے مشترک اصول و مبادی کے تحت تربیت کیا جائے۔

(۶) سر محمد یعقوب کے اس خیال سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ وقتاً فوقتاً علماء و فضلاء کو اہم مسائل پر لیکچر دینے کے لیے دعوت دی جاتی رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ علی گڑھ کو نہ صرف ہندستان کا بلکہ تمام دنیائے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔ آپ اکابرِ ہندستان کے علاوہ، مصر، شام، ایران، ترکی اور یورپ کے مسلمان فضلاء کو بھی دعوت دیجیے کہ یہاں آ کر اپنے خیالات، تجربات اور نتائجِ تحقیق سے ہمارے طلباء میں روشنیٔ فکر اور روحِ حیات پیدا کریں۔ اس قسم کے خطبات کافی معاوضہ دے کر لکھوائے جانے چاہئیں تا کہ وہ کافی وقت، محنت اور غور و فکر کے ساتھ لکھے جائیں اور ان کی اشاعت نہ صرف یونیورسٹی کے طلباء کے لیے بلکہ عام تعلیم یافتہ پبلک کے لیے بھی مفید ہو۔

(۷) اسلامی تعلیم کے لیے کسی ایک زبان کو مخصوص کرنا درست نہیں، اردو عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی اس وقت نصاب کے لیے کافی سامان موجود نہیں ہے۔ لہٰذا سرِ دست ان میں سے جس زبان میں بھی جو مفید چیز مل جائے اس کو اسی زبان میں پڑھنا چاہیے، دینیات اور علومِ اسلامیہ کے معلمین سب کے سب ایسے ہونے چاہئیں جو انگریزی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ اب کوئی ایک رُخا آدمی صحیح معلم دینیات نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے اس بیان کی اس طوالت پر عذر خواہ ہوں، مگر اتنی طویل تفصیل میرے لیے ناگزیر تھی، کیوں کہ میں بالکل ایک نئے راستے کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کے نشانات کو پہچاننے میں خود مجھے غور و فکر کے کئی سال صرف کرنے پڑے ہیں۔ میں حتماً اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے زندہ رہنے کی اب کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ ان کے طرزِ تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جائے اور وہ انقلاب ان خطوط پر ہو جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی موجود ہے اور خود علی گڑھ میں ان کی کمی نہیں، جو میرے ان خیالات کو ایک دیوانے کا خواب کہیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ پیچھے دیکھنے والوں نے آگے دیکھنے والوں کو اکثر دیوانہ ہی سمجھا ہے۔ اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بہ جانب ہیں لیکن جو کچھ میں آج دیکھ رہا ہوں، چند سال بعد شاید میری زندگی میں ہی وہ اس کو بہ چشمِ سر دیکھیں گے اور ان کو اس وقت اصلاحِ حال کی ضرورت محسوس ہوگی جب طوفان سر پر ہوگا اور تلافی ما فات کے مواقع کم تر رہ جائیں گے۔

(ترجمان القرآن جمادی الاخریٰ ۵۵ھ، ستمبر ۱۹۳۶ء)

مرض اوراس کا علاج

اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے نہ وہ محض چند ''مذہبی'' اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے، بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول وقواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بناتے ہیں، جس کے اجزاء کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے۔

آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں، آنکھیں اور کان اور زبان جدا کردیں، معدہ اور جگر نکال دیں، پھیپھڑے اور گردے الگ کردیں۔ دماغ بھی پورا یا کم وبیش کاسۂ سر سے خارج کردیں اور بس ایک دل اس کے سینے میں رہنے دیں۔ کیا یہ باقی ماندہ حصۂ جسم زندہ رہ سکے گا؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟

ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے۔ عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریقِ فکر (Attitude of Mind)، نظریۂ حیات (View of Life)، مقصدِ زندگی اور معیارِ قدر (Standard of Values) جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے جوارح اور قوائم ہیں جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور نظمِ اجتماعی کے تمام وہ اصول جو زندگی کے لیے اسلام نے پیش کیے ہیں وہ اس کے لیے معدے اور جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کو صحیح وسالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال وظروف کی ٹھیک ٹھیک رپورٹیں دماغ تک پہنچائیں اور دماغ ان کے متعلق صحیح حکم لگائے، اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنے خودی کا کماحقہٗ اظہار کرسکے، اس کو پاک صاف فضا کی حاجت ہے جس میں وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیب وطاہر

غذا مطلوب ہے جو اس کے معدے سے مناسبت رکھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔ اس پورے نظام میں اگرچہ قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ اعضاء وجوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔ جب اکثر وبیشتر اعضاء کٹ جائیں، جسم سے خارج کردیے جائیں یا خراب ہوجائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کھچے خستہ وبیمار اعضاء کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟ اگر زندہ بھی رہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہوسکتی ہے؟

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانینِ اسلامی قریب قریب معطل ہیں۔ اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصولِ اسلامی کا نفاذ پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم وبیش غیر مسلم بنا دیا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر زاویۂ نظر بدل گیا ہے۔ کان سنتے ہیں مگر ان کے پردے متغیر ہوچکے ہیں۔ زبان بولتی ہے مگر اس کی گویائی میں فرق آگیا ہے۔ پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسر نہیں کہ ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے۔ معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہوچکے ہیں۔ عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں قریب قریب ساٹھ فی صدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فی صدی جو باقی ہیں وہ بھی کوئی اثر نہیں دکھا رہی ہیں کیوں کہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لیے فالج کا مادّہ ان میں پھیلتا جارہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپ کے سامنے ہے؟ کتنے اعضاء کٹ گئے۔ کتنے مفلوج ہوگئے۔ کتنے موجود ہیں، مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام ہی نہیں کررہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک قلب باقی ہے اور وہ خود بیمار ہورہا ہے۔ کیوں کہ جس طرح وہ ان اعضاء کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسی طرح خود بھی ان سے طاقت حاصل کرتا تھا۔ جب دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ وجگر کا سب فعل خراب ہوگیا تو قلب کیسے صحیح وسالم رہ سکتا ہے؟ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جارہا ہے مگر کیا اس اعظاء بریدہ اسلام میں کوئی کشش ہوسکتی ہے کہ یہ اپنی طرف لوگوں کو کھینچے؟ اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کرسکے؟ بلکہ خاکم بدہن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس نوبت پر کیا یہ ان حوادث کے مقابلے میں جن کا سیلاب روز

افزوں تیزی کے ساتھ آ رہا ہے، اپنے بقیہ اعضاء کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اسی کا نتیجہ ہے کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا (النصر:۲) کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے۔ سارے ہندستان میں اور اس کے اطراف و اکناف میں کہیں بھی نظامِ اسلام اپنی پوری مشینری کے ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اس کے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اس ـ کے پھلوں سے پہچانیں۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء بریدہ اسلام ہے اور سمجھتے ہیں کہ بس یہی اسلام ہے۔ اس کو دیکھ کر بعض تو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، بہت سے ایسے ہیں کہ مسلمان ہونے سے بس انکار نہیں کرتے باقی تمام باتیں ایسی کرتے ہیں کہ ان میں اور منکرینِ اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوں کے دل پھر گئے ہیں مگر چوں کہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ منافقت کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں اور بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے ہیں تا کہ جب عام بلوہ شروع ہو جائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لے کر کھڑے ہوں، کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر دبی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیوں کہ یہ تنِ مردہ جسے تم لیے بیٹھے ہو، نہ خود تمھیں کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ان فوائد ہی سے متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں جذب ہونے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا باضابطہ مثلہ کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہیے، باقی زندگی کا سارا پروگرام وہی اختیار کر لینا چاہیے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جس کو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ لوگ خود دھوکے میں ہیں یا دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے جس کو یہ لوگ، بھول گئے ہیں یا بھلا رہے ہیں کہ تمام معاملاتِ زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کرنے اور غیر اسلامی اصول پر عامل ہو جانے کے بعد مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل قطعاً بے زور ہو جاتے ہیں۔ نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے اور نہ عمل جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عقائد اور یہ عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جن کو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان پر تعمیر ہو۔ جب یہ عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثارِ قدیمہ سے بے فائدہ

بے ضرورت دلچسپی کب تک باقی رہ سکے گی؟ نئے نظامِ زندگی میں جو بچہ پرورش پا کر جوان ہو گا وہ پوچھے گا کہ چند لاحاصل عقیدوں اور چند بے نتیجہ رسموں کا یہ قلادہ کیوں میرے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ میں کیوں اس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اس پر ایمان رکھوں جس کے سارے احکام اب بے کار ہو چکے ہیں؟ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو انسان گزر چکا ہے آج میں اس کو کس لیے خدا کا رسول مانوں؟ جب اس زندگی میں وہ میری رہنمائی ہی نہیں کرتا تو محض اس کی رسالت تسلیم کرنے سے کیا فائدہ، اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا؟ یہ نظامِ حیات جس پر میں عمل کر رہا ہوں اس میں نماز پڑھنے اور نہ پڑھنے، روزہ رکھنے اور نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا ربط ہے ان اعمال اور اس کی زندگی کے درمیان؟ یہ بے جوڑ پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا رہے؟

یہ منطقی نتیجہ ہے دین و دنیا کی علاحدگی کا اور جب یہ علاحدگی اصولاً اور عموماً مکمل ہو جائے گی تو یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا۔ جس طرح نظامِ جسمانی سے الگ ہو جانے کے بعد قلب بے کار ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوتِ حیات دیتے ہیں اور اسلامی زندگی عقائد اور عبادات کو طاقت بہم پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ان دونوں میں ایک زندہ نظامِ جسمانی کے اعضاء کا تعلق ہے جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے۔ غیر اسلامی میں اسلامی عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہو گا جیسے گوریلا کے جسم میں انسانی دماغ اور انسانی دست و پا۔

یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک مختصر گروہ پر ہی مترتب ہو رہا ہے۔ نہیں، جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں اس مذہب کی محبت اور عزت موجود ہے، خواہ نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پرانے گروہ کے، ان سب پر کم و بیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جس کے طبیعی نتائج سے کوئی بھی مسلمان محفوظ نہیں ہے اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اس میں حصہ مل رہا ہے اور ہمارے علماء و مشائخ بھی اس میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔ لیکن سب سے زیادہ خطرہ میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں ۶ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے

پاس صرف اسلام کا نام باقی ہے جس سے ان کو غیر معمولی محبت ہے۔ نہ علمی حیثیت سے یہ غریب اس چیز سے واقف ہیں جس پر یہ جان دے رہے ہیں اور نہ عملی حیثیت سے کوئی ایسا نظامِ زندگی موجود ہے جو انھیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ ان کی جہالت سے پورا فائدہ اٹھا کر ہر گمراہ کرنے والا ان کے عقائد کو اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراطِ مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ انھیں یہ اطمینان دلا دینا کافی ہے کہ یہ ضلالت جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے یہی عین ہدایت ہے یا کم از کم اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انھیں بھٹکا لے جاسکتے ہیں، خواہ وہ قادیانیت کا راستہ ہو یا اشتراکیت کا یا فسطائیت کا۔ ان کے روز افزوں افلاس اور ان کی ہول ناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو موجودہ بے نظمی کی حالت میں اصولِ اسلام کے مطابق حل کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلے میں معاشی و تمدنی اصولوں کو لے کر اٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھا دے جو عام لوگوں کے لیے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروڑوں مفلس اور فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلغین کے لیے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ بورژوا طبقہ کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقہ کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بن کر غریب عوام کو اپنے ہاتھ میں لیں، ان کے اندر خود غرضی، حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں، ان کے جائز حقوق سے بڑھ کر انھیں دولت میں حصہ دلوانے کا لالچ دلائیں۔ خوش حال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کرنے کا وعدہ کریں، اور اس طرح ملک کے سوادِ اعظم کو اپنی مٹھی میں لے کر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں اور کروڑ پتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں۔ کیوں کہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں۔ یہ ان کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے۔ پھر جب بے چارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی

امید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جذبہ اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل چیز روٹی ہے۔ وہ جس طریقے سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے:

> ”غریبوں، مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے، اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے، اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے۔ وہی کپڑا اور روٹی جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔“

یہ ابتدائی سبق ہے مذہبِ اشتراکیت کا اور جس آن یہ سبق بے چارے جاہل و مفلس مسلمانوں کو دیا جاتا ہے کہ ہم تمھارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے:

> ”مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے زندہ و تابندہ اور پایندہ ہی رہا ہے۔“(۱)

گزشتہ بیس (۲۰) سال کے اندر روسی اشتراکیت کے جو اثرات مسلمانانِ روس کی نوخیز نسلوں پر مترتب ہوئے ہیں وہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل مسلمانانِ ہند کے سامنے بھی دھمکیاں دیتا ہوا آ رہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاعِ ایمان کو خاکستر کر دینے کے لیے بڑھ رہی ہے۔ ابھی تک سر چشمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گزار دیے گئے تو یہ اتنا بڑا سیلاب بن جائے گا کہ اس کے مقابلے میں ہاتھیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔

ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لا حاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لیے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں شائع کر دیے جائیں تو یہ حالات رو براہ نہیں آ سکتے۔ محض زبان اور قلم سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لایا

(۱) یہ دونوں فقرے جو یہاں نقل کیے گئے ہیں ایک مسلمان صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں، جو ایک کثیر الاشاعت مسلم اخبار کے کالموں میں شائع ہوا ہے۔

جماعت میں اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ اس جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا۔ جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے۔ ان پر اللہ کا رنگ (صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ) اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جدھر جائیں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھادیں۔ ان میں کیرکٹر کی اتنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں اور جوان کے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے۔ ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں وہ مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں اور ان کی تعلیم و تربیت دونوں کے ذریعہ سے اس قابل بنا دیا گیا کہ جہاں جائیں، زندگی کے اسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں جو قرآن و سنت نے انھیں دیا ہے اور ہر قسم کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جز گہرے مطالعہ اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس تنظیم میں کام کو چار بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تفقہ حاصل کریں اور جن میں یہ استعداد ہو کہ لوگوں کو دین اور اس کے احکام بہترین طریقے پر سمجھا سکیں: فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ (التوبہ:۱۲۲)

(۲) کچھ لوگ ایسے تیار کیے جائیں جن کی زندگیاں اسلام کے نظامِ عمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی و جہد کے لیے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو کسبِ معیشت سے بے نیاز کرے لیکن خود انھیں اس کی پروا نہ ہو، چاہے معیشت کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے مجبور ہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے اس کام میں لگے رہیں جو ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ (آل عمران:۱۰۴)

(۳) پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر ہر شخص اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے۔ وہ اپنے دنیا کے کاروبار چلاتا رہے۔ مگر ہر کام میں یہ مقصد اس کے سامنے ہو، تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صناع اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم

اپنی ملازمت میں اس مقصد کو نہ بھولے۔ وہ ہمیشہ اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ یہ سب کام جینے کے لیے ہیں اور جینا اس کام کے لیے ہے۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے، اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی پابندی کرے اور جہاں دنیوی فوائد میں اور اصولِ اسلام میں تناقض واقع ہو جائے وہاں فوائد پر لات مار دے اور اصول کو ہاتھ سے دے کر اسلام کی عزت کو بٹہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو اس کو اسلام کی خدمت میں صرف کر دے، ان لوگوں کا ہاتھ بٹائے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کی ہیں۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ (آل عمران:۱۱۰)

(۴) باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دارالاسلام میں آئیں اور ایسے ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہو۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھیں گے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جائیں گے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ (التوبہ:۶)

اس طرح صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی اور رہبر نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ دیکھتے دیکھتے اس نے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی حتیٰ کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانے سے بھرا ہوا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب نظامِ اسلامی میں بہت کچھ برہمی پیدا ہو گئی تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقہ کی پیروی میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر گر گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصور آ جاتا ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہو اور صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے۔ مگر اصل میں یہ خانقاہ بھی اسی نمونہ کی ایک نقل تھی جسے سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا۔ صوفیائے کرام جن لوگوں میں استعداد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انھیں اسی کام کے لیے تیار کرتے تھے جس کے لیے مرشدِ اعظم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تیار کیا کرتے تھے۔

اب جو لوگ اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں ان کو پھر اسی طریقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اگر ہم ہندستان سے نکل کر کہیں آزاد فضا نہیں پا سکتے جہاں مدینہ طیبہ کی طرح "دارالاسلام" بنایا جا سکے تو کم از کم ہم کو اسی ملک میں ایسی تربیت گاہیں بنانی چاہئیں جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جائے جہاں اخلاق اسلامی ہو۔ معاشرت اسلامی ہو۔ عملی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گردوپیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو۔ جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسول نے اس کی اجازت دی ہے یا اس کا حکم دیا ہے اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ خدا اور رسولؐ نے اس سے منع کیا ہے یا اسے ناپسند کیا ہے۔ جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول، یہ غیر اسلامی فضا نہ ہو، جس نے ہر طرف سے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے۔ جہاں کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی اثرات میں سے جن کو ہم روح اسلامی کے موافق پائیں صرف ان ہی کو داخل ہونے دیں اور جن کو منافی پائیں ان کی اپنی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل و دماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں۔ جہاں ہم کو ایسی فضا میسر آ سکے کہ مسلمان کی طرح سوچ سکیں، مسلمان کی سی نظر اپنے اندر پیدا کر سکیں، ان اسلامی صفات کو نشوونما دے سکیں جو اس دارالکفر کی مسموم آب و ہوا میں فنا ہوتی چلی جا رہی ہیں، ان گندگیوں اور آلائشوں سے اپنی زندگی کو پاک کر سکیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشوونما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار و اعمال میں گھس گئی ہیں، جن کا شعور تک بسا اوقات ہمیں نہیں ہوتا اور جن کو اگر ہم محسوس کر بھی لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جابر و قاہر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنے کے ہم اپنے آپ کو ان سے بچا نہیں سکتے۔ اس قسم کی تربیت گاہوں میں ایسے لوگوں کو جمع کیا جائے جو سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں اور وہاں ان کو صحیح تعلیم و تربیت دے کر اس خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ وہاں کے کام کا نقشہ وہی ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کا نقشہ تھا۔ اسی طرح کام کو چار شعبوں پر تقسیم کیا جائے اور اسی طرح ہر شعبہ میں آدمیت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر کی جائے۔

(۱) ایک شعبہ ایسا ہو کہ جس میں اعلیٰ درجہ کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے جو لوگ علوم دنیوی میں دستگاہ رکھتے ہوں انھیں مغربی زبانوں سے اور علوم جدیدہ سے روشناس کیا جائے، اور جن حضرات نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہو انھیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے، پھر یہ لوگ قرآن اور سنت کا گہرا مطالعہ کر کے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں۔ اس کے بعد ان کے مختلف گروپ بنا دیے جائیں۔ ہر گروپ ایک ایک شعبۂ علم لے کر اس میں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتب کرے۔ زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصول اسلام کے مطابق ان کا حل تلاش کرے۔ علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہو گیا ہے اس کو نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سر نو مدوّن کرے اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا شعبہ ایسا ہو جس میں خدمت اسلام کے لیے اچھے کارکن تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دھن کے پکے اور اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والے لوگ، جو ایک زبردست انقلابی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں، جن کی زندگی سادہ ہو، جن میں جفاکشی ہو، جن میں پورا ضبط و نظم پایا جائے، اور جن کی عملی سیرت ٹھیٹھ مسلمان کی سی ہو۔ یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (Social Order) اور ایک نئی تہذیب (Civilization) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے تاکہ ظلم و جور کی حکومت کو عدل کی حکومت میں تبدیل کیا جا سکے۔

(۳) تیسرے شعبہ میں ایسے لوگ ہوں جو صرف تھوڑی مدت کے لیے تربیت گاہ میں رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں، انھیں صحیح علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہے رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں۔ دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں۔ اپنے اصولوں میں سخت ہوں، اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں۔ ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے ہو۔ پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور ان لوگوں کو ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار رہیں جو شعبہ نمبر ۲ کے تحت کام کر رہے ہوں۔ یہ ان کو مالی مدد بھی دیں، ان کے کاموں میں عملاً بھی شریک ہوں، اور جہاں رہیں وہاں کی فضا کو انقلابی پارٹی کی موافقت میں تیار بھی کرتے رہیں۔

(۴) چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے ہو جو محض عارضی طور پر تربیت گاہ میں آ کر کچھ علمی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں۔

ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، تاکہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کا گہرا نقش لے کر واپس جائیں۔

یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے اس نظام کا جو ہمارے نزدیک اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ضروری مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ یہ اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ و اصحابِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے، اور اکثر دین دار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں، جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں، جیسا طرزِ معاشرت ان کے گھروں میں تھا، بعینہٖ وہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (Fossilized) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں، اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دین دار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے، درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستہ پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے، اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب

قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں ہم یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے۔ ہم کو "خَيْرَ أُمَّةٍ" جو بنایا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (Rear Guard) کی حیثیت سے لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے، ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور ہمارے خیر امت ہونے کا راز أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیے یہ ہے کہ انھوں نے قوانینِ طبیعی کو قوانینِ شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انھوں نے اس کے قالب میں اسلامی تہذیب کی روح پھونکی۔ اس وقت جتنی طبیعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی ان سب کو انھوں نے اس تہذیب کا خادم بنایا اور غلبہ و ترقی کے جس قدر وسائل تمدن نے فراہم کیے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار و مشرکین سے سبقت لے گئے۔ تاکہ خدا سے بغاوت کرنے والوں کی تہذیب کے مقابلے میں خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کامیاب ہو۔ اسی چیز کی تعلیم خدا نے اپنی کتاب میں ان کو دی تھی وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ۔ ان کو یہ سکھایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہنچتا ہے، بلکہ اس کا اصلی حق دار مسلم ہی ہے۔ پس نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبیعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں ہے، ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ اربابِ نشاط یا ناشرِ کذب و افترا بناتی ہے، ہوائی جہاز ناپاک نہیں ہے، ناپاک وہ تہذیب ہے جو ہوا کے فرشتے سے خدائی قانون کے بجائے شیطانی اغوا کے تحت خدمت لیتی ہے۔ سینما ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو خدا کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام لیتی ہے اور اس ناپاک تہذیب کو فروغ اسی لیے ہو رہا ہے کہ اس کو فروغ دینے کے لیے خدا کی بخشی ہوئی ان تمام طاقتوں سے کام لیا جا رہا ہے جو اس وقت انسان پر منکشف ہوئی ہیں۔ اب اگر ہم اس

فرض سے سبک دوش ہونا چاہتے ہیں جو الٰہی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے ہم پر عائد ہوتا ہے تو ہمیں بھی انھیں طاقتوں سے کام لینا چاہیے۔ یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا۔ خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی ہی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اُسے بھگتنی پڑے گی کیونکہ اس عالمِ اسباب میں خدا کی جو سنت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔

اس تصریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک جسے میں پیش کر رہا ہوں نہ تو کوئی ارتجائی (Reactionary) تحریک ہے اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جس کے پیشِ نظر صرف مادّی ارتقاء ہو۔ میرے پیشِ نظر جو تربیت گاہ ہے اس کے لیے گروکل کانگڑی، ستیہ گرہ آشرم، شانتی نکیتن اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے، اور اسی طرح جس انقلابی پارٹی کا تصور میرے ذہن میں ہے اس کے لیے اٹلی کی فاشست اور جرمنی کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی میں بھی کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول اور اس حزب اللہ میں ہے جسے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب کیا تھا۔ (ترجمان القرآن، شوال ۵۶ھ: دسمبر ۱۹۳۷ء)

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۰۳-۱۹۷۹) بیسوی صدی عیسوی کے عظیم المرتبت اسلامی اسکالر، رفیع الشان مصنف، انقلابی مفکر اور صاحب عزم وثبات قائد دورہ نما تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اعلاے کلمۃ الحق اور اسلام کے غلبہ وقیام کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ایک تحریک ــــــ جماعت اسلامی ــــــ کی بناڈالی، جو ۱۹۴۱ سے پوری یک سوئی اور تن دہی کے ساتھ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے ساعی وکوشاں ہے۔ متعدد بار جیل گئے، ۱۹۵۳ میں ختم نبوت سے متعلق ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں پھانسی کی سزا بھی تجویز ہوئی، لیکن کبھی ان کے پاے استقامت میں لغزش نہ آئی۔

مولانا مودودیؒ ۲۵ رستمبر ۱۹۰۳ (۳ ر رجب المرجب ۱۳۲۱ ہجری) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم سید احمد حسن مودودیؒ ایک محتاط وکیل اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے، مولانا شاہ محی الدینؒ سے انھیں شرف بیعت حاصل تھا، والدہ محترمہ رقیہ خاتونؒ بھی ایک دین دار وخدا ترس خاتون اور اس عہد کے نامور شاعر مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی (تلمیذ غالب) کی بیٹی تھیں۔ مولانا نے قاعدہ بغدادی سے لے کر قرآن ناظرہ، اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ عربی زبان کی صرف ونحو اور فقہ وحدیث کی بعض کتابیں بھی گھر پر ہی مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ انگریزی ایک نومسلم انگریز سے سیکھی۔ گھر پر مناسب تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اورنگ آباد کے مدرسہ فوقانیہ میں داخلہ لیا۔ ۱۳ ر سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ حدیث میں صحاح اور فقہ ومعقولات کی کتابیں دہلی میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ، مولانا شریف اللہ خاںؒ اور علامہ عبدالسلام نیازیؒ سے پڑھیں۔

مولانا نے ۱۰۰ سے زائد کتابیں لکھیں، جن میں تفہیم القرآن، سنت کی آئینی حیثیت، خطبات، دینیات، تفہیمات، رسائل ومسائل، خلافت وملوکیت، سود، پردہ اور حقوق الزوجین ان کی اہم تصانیف سمجھی جاتی ہیں۔ دنیا کی کم وبیش چالیس زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب ’’تنقیحات‘‘ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کوئی مستقل ومربوط تصنیف نہیں بلکہ یہ ان کے ان مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے مختلف اوقات میں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر لکھے تھے۔ ان میں غیر اسلامی اثرات اور مسلمانوں کی کوتاہیوں پر تنقید بھی ہے اور غلط فہمیوں میں الجھے ہوئے حقائق کی تنقیح بھی۔ یہ وہ مضامین اور مقالے ہیں، جو اب تک لاکھوں انسانوں کو اسلام سے قریب کرنے کا ذریعہ بنے ہیں۔

MARKAZI MAKTABA ISLAMI PUBLISHERS
NEW DELHI
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

PN-741